کلامِ اقبال میں قرآنی آیات و احادیث
اور
مذہبی اصطلاحات کا جائزہ

محمد منظور عالم

کلامِ اقبال میں قرآنی آیات و احادیث
اور
مذہبی اصطلاحات کا جائزہ

کلامِ اقبال میں قرآنی آیات و احادیث
اور
مذہبی اصطلاحات کا جائزہ

محمد منظور عالم

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ع ۱۳۳۴

© محمد منظور عالم

سنہ اشاعت : ۱۹۹۵ء

قیمت : ۸۰ روپے

بہ اہتمام : اختر زماں

تزئین کار : انیس احمد

طباعت : ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دلّی

KALAM-E-IQBAL MEIN QURANI
AAYAT-O-AHADEES AUR
MAZHABI ISTELAHAT KA JAIZAH

Edited By **Mohd. Manzoor Alam**

Price Rs. 80/-
1995

ISBN-81-7160-065-4

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
URDU GHAR : 212 ROUSE AVENUE
NEW DELHI-110002

فہرست

حرفِ آغاز	خلیق انجم	۷
پیش لفظ		۱۳
کلامِ اقبال میں قرآنی آیات		۱۷
احادیث		۱۴۳
مذہبی اصطلاحات		۱۵۳
اقبال کا نظریۂ علم		۱۶۱
اقبال کے کلام میں انبیاء کا ذکر		۱۶۳
خودی		۱۷۱
شاہین کا تصوّر		۱۷۹
کتابیات		۱۸۱

حرفِ آغاز

علامہ اقبال ایک عظیم شاعر ہی نہیں ایک مفکر، دانشور، سیاسی و سماجی رہنما اور مصلح بھی تھے۔ انھوں نے اعلا ترین جدید تعلیم حاصل کی تھی۔ مغربی فلسفے پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے قرآن اور اسلام کا بہت وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے وہ مشرقی اور مغربی افکار کا بہت اچھا تقابل کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ صنعتی انقلاب نے انسان کے لیے جس نظامِ فکر کی تشکیل کی ہے اور فاشزم، جمہوریت، سرمایہ داری جیسے سماجی، سیاسی اور معاشی نظام پیش کیے ہیں۔ وطنیت، قومیت اور نسلیت کے نام پر جو بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کی ہیں، وہ اندر سے کھوکھلی ہیں اور زیادہ دن چلنے والی نہیں ہیں۔ یورپ نے جس جمہوریت کو فروغ دیا، اس میں عقل و دانش اور فہم و فراست کو نہیں، انسانوں کی تعداد کی اہمیت ہے۔ جمہوریت کی خوبیوں سے وہ اقلیتیں بخوبی واقف ہیں جو کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود اکثریت کے سامنے بے بس اور لاچار ہیں۔ اسی لیے علامہ مغربی جمہوریت کے خلاف تھے۔ مغربی اور مشرقی افکار کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد علامہ اقبال اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قرآن انسانی زندگی کے تمام روحانی، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے، جو انسان کو اَبد تک ہدایت، قوت اور بصیرت سے بہرہ اندوز کرتا رہے گا۔ اسلام محض ایک مذہبی یا روحانی ہدایت ہی نہیں ہے، بلکہ عالم انسانیت کے لیے ایک ہمہ گیر اور اصلاحی تحریک بھی ہے۔ چوں کہ مغربی تہذیب کی بنیاد عقلیت اور مادّیت پر ہے۔ اس لیے اقبال کی نظر میں مشینوں کی بنیاد پر پیدا کی ہوئی یہ تہذیب مادّی آسائشیں تو فراہم کر سکتی ہے، لیکن یہ انسان کے دل و دماغ کو بے حس کر دیتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں :

ہے دل کی موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اقبال کا عقیدہ ہے کہ قرآنِ کریم ایک ایسی جامع اور مکمل کتاب ہے جس کے بعد انسان کو کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

اگرچہ اسلام میں قرآن کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔ عام مسلمانوں کی طرح اقبال کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ حدیث قرآن کا تکملہ ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق آنحضرتؐ کے اقوال اور افعال قرآن کے مقاصد کو مکمل نہیں، بلکہ واضح کرتے ہیں، یعنی جو کچھ قرآن میں کہا جا چکا ہے، صحیح اور مستند احادیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ تبدیلی، حذف یا اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ اقبال قرآن کے ایک ایک لفظ کے پابند سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ حدیث کے پابند نہیں ہیں۔ کیوں کہ اُن کے خیال کے مطابق خاصی تعداد میں ایسی حدیثیں موجود ہیں، جنھیں عام لوگ مستند سمجھتے ہیں، لیکن تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ وہ ضعیف ہیں۔ اس لیے انھیں پوری طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ اقبال کا عقیدہ ہے کہ اسلام کے تمام تر بنیادی عناصر قرآن میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ خود قرآن نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس میں انسانیت کے لیے تمام ہدایتیں تفصیل سے بیان کر دی گئی ہیں۔ قرآن نے خود کو فطرت اور حیاتِ انسانی کے تمام قوانین کا آئینہ کہا ہے اور یہی وہ دینِ قیم ہے جسے لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ اور لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا کہا جا سکتا ہے۔ اقبال کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ قرآن میں کسی تنسیخ، تبدیلی یا اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔

اقبال نے اپنی مشہور نظم "بحضور رحمۃ للعالمین" میں قرآن اور آنحضرتؐ سے اپنے قلبی اور ذہنی لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر میرے دل کے آئینے میں اور میرے الفاظ میں قرآن

کے علاوہ کوئی اور چیز چھپی ہوئی ہو تو رسولِ اکرمؐ مجھے حشر کے دن آپ خوار و رسوا کریں اور مجھے اپنے پائے مبارک کو بوسہ دینے کی لذّت سے محروم رکھیں۔ اصل اشعار یہ ہیں :

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ورنہ بحرفم غیر قرآں مضمر است
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اقبال نے "تشکیلِ جدیدِ الٰہیات اسلامیہ" کے پہلے خطبے میں لکھا ہے کہ :

"جس قدر انسان کے ذوق ووجدان اور اخلاق و روحانیت ترقی کرتے جائیں گے، اسی قدر اس پر قرآنی مطالب آشکار ہوتے جائیں گے۔"

گویا اقبال کا عقیدہ ہے کہ قرآن صرف ایک زمانے اور اس زمانے کے مخصوص انسانی گروہ کے لیے نہیں پورے عالمِ انسانیت کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا اور قرآن ایسی بھرپور کتاب ہے کہ ہر عہد میں انسان کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ بقول اقبال

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم

قرآن کے بارے میں اقبال کہتے ہیں :

داستانِ کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کن از ام الکتاب
جز بقرآں ضیغمی و روباہی است
فقر قرآن اصل شاہنشاہی است
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

اقبال کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ قرآن نوعِ انسان کے لیے آخری پیام ہے۔ خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہ پیغام ہم تک پہنچایا ہے۔ خدا کا آخری پیام ہونے کی وجہ سے

یہ مکمل اور جامع ہے۔ بقول اقبالؔ

نوع انساں را پیام آخریں
حامل او رحمۃ للعالمین!

"جاوید نامہ" کے آخری حصے میں اقبالؔ نے جاوید اور نئی نسل کو خطاب کرتے ہوئے ہمارے عہد میں قرآن کی غیر معمولی معنویت اور اسلام کی بگڑی ہوئی شکل پر تبصرہ کرتے ہوئے ایسے بصیرت افروز اور معنی خیز اشعار کہے ہیں:

در مسلماناں مجو آں ذوق و شوق
آں یقیں آں رنگ و بو آں ذوق و شوق
عالماں از علمِ قرآں بے نیاز
صوفیاں درندہ گرگ و مود راز
گرچہ اندر خانقاہاں ہائے و ہوست
کہ جواں مردے کہ صہبا در کدوست

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اقبالؔ کے فکری سرچشموں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اقبال کے نقادوں نے قرآن، رسولؐ اور اسلام سے اقبالؔ کے ذہنی رشتے کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اقبالؔ ان چند شاعروں میں ہیں، جن پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ جب بھی کوئی نقاد ان کے فن اور شخصیت کا جائزہ لیتا ہے تو کوئی نہ کوئی نئی بات سامنے آتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب کی طباعت کا یہی جواز ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن محمد منظور عالم صاحب نے بہت محنت، جستجو اور دیدہ ریزی سے کام لے کر اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کلامِ اقبال میں قرآنی آیات و احادیث اور مذہبی اصطلاحات کا جائزہ

لیا ہے۔ نیز مدلّل طریقے سے بیان کیا ہے کہ اقبال کے تمام تر افکار، قواعد اور فلسفے کا ماخذ قرآن ہی ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب اقبالیات میں ایک اہم حصّہ ہے۔

خلیق انجم

پیش لفظ

علاّمہ اقبال اور ان کے کلام پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مزید لکھنے کی گنجائش باقی ہے۔ اقبال سے دلچسپی مجھے شروع ہی سے تھی۔ لیکن ایم۔ فل میں یہ دلچسپی اس لیے بڑھ گئی کہ استادِ محترم پروفیسر سیّد مجاور حسین رضوی کا انداز تفہیم ذہن کے دریچوں کو کھول کر کلامِ اقبال کے ان گوشوں کو واضح کرتا تھا جن کی طرف خیال بھی نہ جا سکے۔ ادھر یہ بھی احساس پیدا ہوا کہ اقبال جیسے شاعر کو سمجھنے کے لیے اُستادِ محترم کی طرح بسیط علم کی ضرورت ہے لیکن انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی، ہمّت بڑھائی اور ایسا موضوع میرے لیے منتخب کیا جو دلچسپ بھی ہے اور چوں کہ میں بحمداللہ حافظِ قرآن بھی ہوں اس لیے میرے لیے آسان بھی تھا۔ پھر مجھے ایک کتاب ہاتھ لگی جو پاکستان میں چھپی تھی ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں کی تحریر کردہ "اقبال اور قرآن" اس سے بے حد مدد ملی۔ پھر بھی یہ احساس ہوتا رہا کہ فاضل مصنّف نے اقبال کے ہر شعر پر کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی آیت کو منطبق کرنے کی شعوری کوشش کی ہے اور جس سے شاید میں اپنی کم علمی کے سبب اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر پایا چنانچہ جہاں ان سے اتفاق ہے وہاں حوالہ دیا گیا ہے۔ باقی میری اپنی تعبیرات ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر فضلِ الٰہی عارف کے مضامین "قرآنی آیات" و احادیث" جو ان کی کتاب "متاعِ اقبال" میں شامل ہے میرے لیے بہت اہم ثابت ہوئے۔

میرا مزاج مشرقی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ تمہید کچھ طویل ہے لیکن جب تک زندگی کے تصوّر میں نظم وضبط کی اہمیت کا اندازہ نہ لگایا جائے بات آگے نہیں بڑھ سکتی اور یہ نظم وضبط نظریہ کے بغیر ممکن نہیں۔ قرآنی آیات کے ضمن میں سورت، آیت اور تراجم کی نشاندہی کرنا ضروری ہے۔ اور یہی طریقہ کار احادیث کے لیے بھی اختیار کیا جانا چاہیے۔ یہاں یہ عرض کردینا بہت ضروری ہے کہ ایک بہت معروف حدیث مجھے بھی حدیث کی کتابوں میں نہ مل سکی جس کی نشاندہی رشید حسن خاں نے کی ہے۔ یہ صرف معروف ہے، حدیث کی کسی معتبر کتاب میں موجود نہیں ہے[1]۔

مقالے کا ایک حصّہ ان مخصوص شخصیات اور علامتوں کی توضیح وتشریح کے سلسلے میں ہے جن کا قرآن میں بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور جن کے مجموعی تاثر کو اقبال نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ یہ وہ شخصیات اور علامتیں ہیں جن کے زیرِ اثر اقبال کے نظریات کی تشکیل عمل میں آئی اور اقبال نے اپنی مخصوص علامتیں وضع کیں۔

درس گاہوں میں لکھے جانے والے تحقیقی مقالوں میں ایک حصّہ وہ بھی آتا ہے جہاں مقالہ نگار شکریہ ادا کرتا ہے۔ یہ حصّہ بہت کم لوگوں کی نظروں سے گزرتا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے کیوں کہ ان چند لفظوں کے ذریعے لکھنے والے کے خلوص اور جذبۂ احسان شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ سارے تاثرات بطور یادگار محفوظ ہوجاتے ہیں۔ میں جو کچھ تحریر کر رہا ہوں یہ رسم دنیا نہیں بلکہ میرے اپنے شدید احساسات ہیں جو قلم کی نوک سے اُبل کر صفحۂ قرطاس پر پھیل رہے ہیں۔ ان احساسات کو قلم بند کرنے کا مقصد بھی یہ ہے کہ آنے والے دَور کے طالب علم جب اسے دیکھیں تو ان کے ذہن میں ان شخصیات کی ایک تصویر بن سکے۔ حسرت نے کہا تھا کہ ؎

طبعِ حسرت نے اُٹھایا ہے ہر اُستاد سے فیض

میں نے بھی بقدرِ ظرف اپنے ہر اُستاد سے فیض حاصل کیا جن میں ڈاکٹر انورالدین،

---

[1] رشید حسن خاں کا تبصرہ، احادیث کے ضمن میں حاشیے میں بیان کیا گیا ہے۔

پروفیسر ثمینہ شوکت اور موجودہ صدر شعبۂ اُردو، پروفیسر سیدہ جعفر صاحبہ بھی شامل ہیں۔ مجھے یہ اعزاز ہے کہ مجھے ان سب کی شفقتیں حاصل رہیں۔ پروفیسر گیان چند نے بھی مجھے درس دیا اور تحقیق کی طرف مائل بھی کیا۔ انھوں نے بھی مجھے اقبالؔ پر کام کرنے پر اکسایا تھا اور فرمایا تھا ... ... "جن موضوعات پر کام ہو چکا ہے ان پر بھی کام کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ "ہمتِ مرداں مددِ خدا"۔ ڈرو نہیں آگے بڑھو ... ..." ڈاکٹر رحمت یوسف زئی نے بھی مجھے درس دیا ہے لیکن اس مقالے کے سلسلے میں انھوں نے بے حد مدد کی اور مشورے دیے سب سے بڑھ کر یہ کہ جب میں پست ہمت ہو رہا تھا اس وقت ان کی حوصلہ افزائی نے مجھے آگے بڑھایا۔ ان کے مشورے پر میں اقبال اکیڈمی گیا اور وہاں جناب کریم رضا اور ظہیر الدین احمد صاحب نے اقبال شناسی کے بہت سارے گوشوں کی طرف توجہ دلائی اور کئی بے حد اہم کتابیں عنایت کیں۔

میرے نگراں، اُستادِ محترم پروفیسر سیّد مجاور حسین رضوی صاحب کی شفقت اور سرپرستی کی بدولت ہی یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکا۔ ایم۔ اے کے دوران پھر ایم۔فل میں میں نے ان کے آگے زانوئے ادب تہ کیے۔ اقبالؔ سے مری دلچسپی کا ایک اہم سبب استادِ محترم ہیں ان کے سمجھانے کا انداز، نئے نئے پہلوؤں کی طرف ذہن کو متوجہ کرانے کی مساعی، مرے خیال میں منفرد ہے۔ خصوصاً عملی تنقید پڑھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ واقعی "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"۔ علم ان کی شخصیت کا ایک جزو ہے۔ ایک ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپ کو قرآن فہمی سے بے حد شغف ہے۔ اقبالؔ کے کلام میں جو قرآن کے اثرات جا بجا نظر آئے ہیں ان کی طرف دراصل استادِ محترم ہی نے متوجہ کیا تھا۔ میں ان کا ممنون ہوں۔

میں اپنے دوست احباب کا ممنون ہوں جنھوں نے مرے مقالے کی تکمیل میں مدد کی۔ خصوصاً محمد الیاس، علی نثار اور عظمیٰ تسنیم کا جن کی نیک خواہشات ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ ان کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علم محمد جعفر ایم۔ اے کا بھی میں بے حد احسان مند ہوں جنھوں نے اپنے مشوروں کے علاوہ مالی تعاون سے بھی نوازا۔ میں پیپس انجلس ہائی اسکول

کے ٹیچر عوض بن صالح قریشی صاحب (بی ایس سی) کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی بے حد مصروفیات کے باوجود میرے مقالہ کی تکمیل میں اسانھ دیا۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنی شریکِ حیات کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی توجّہ اور محبّت کی وجہ سے یہ کام بھی انجام پایا۔ ہر مرحلے پر انھوں نے میری مدد کی اور اس علمی کام میں بھی اپنی رفاقت کا حق ادا کرتی رہیں۔

آخر میں مَیں اپنے مرحوم والدین کے لیے دعا گو ہوں کہ پروردگار ان کی مغفرت فرمائے اور جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤں۔ سو یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور دُعا ہے ہمیشہ جاری رہے۔

اس مقالے میں کوتاہیاں بھی ہوسکتی ہیں کیوں کہ کوئی کام حرف آخر نہیں ہوسکتا۔ اگر توجّہ دہانی سے میں ان خامیوں کو دُور کرسکا تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھوں گا۔

محمّد منظُور عالم
سنٹرل یونیورسٹی، حیدر آباد۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

کلامِ اقبال میں قرآنی آیات

انسانی وجود زندگی کا ایک رُخ ہے اس لیے کہ اس کائنات میں ہر شے اپنا وجود بھی رکھتی ہے اور یہ وجود متحرک بھی ہوتا ہے اور کسی نہ کسی قاعدے یا قانون کے تحت متحرک ہوتا ہے۔

یہی دراصل زندگی ہے اور اسی زندگی کو گزارنے کے لیے کوئی نہ کوئی اصول یا قانون اپنانا ضروری ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں اپنی بات کی وضاحت کے لیے دو[۲] فلسفیوں کے افکار پیش کیے جا رہے ہیں۔

کانٹ کہتا ہے۔ "میں مسلسل ناکامیوں سے گھبرا کے زندگی سے اُکتا جاتا ہوں لیکن مرے پاس عقل و شعور ہے جو مجھ سے یہ دریافت کرتی ہے کہ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں تاکہ مزید آنے والے مصائب سے بچ جاؤں۔ اب میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا میرے عمل کا یہ اصول عالمگیر فطرت کا قانون بن سکتا ہے۔ میرا اصول یہ ہے کہ میں ذاتی محبت کے تحت اپنی زندگی کو مختصر کرنا چاہتا ہوں اور ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ذاتی محبت کا یہ تصور عالمگیر قانون بن سکتا ہے۔ جیسے ہی میں یہ سوچتا ہوں فوراً سمجھ میں آتا ہے کہ فطرت کا قانون زندگی کو سنوارنا اور آگے بڑھانا ہے اس لیے میرے سوچنے میں تضاد ہے اور اس لیے یہ اصول عالمگیر قانون نہیں بن سکتا[۱]۔"

Introductory reading in philosophy

By Aurom Stroll Richard H. Popkin P. 516

کانٹ کے اس مقولے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی گزارنے کے لیے کچھ قوانین کی ضرورت ہوتی ہے زندگی بہر حال پابندیوں کا مطالبہ کرتی ہے آج کے دور میں ایک محاورہ رائج ہے "جنگل کا قانون" اس کے معنی بہر حال یہ ہیں کہ جنگل میں بھی "وہ لاکھ وحشیانہ سہی" قانون ضروری ہے۔

ہیگل کہتا ہے۔" خود شعوری کی وہ منزل جو متناقص اجزاء کے تصادم سے حاصل ہوتی ہے۔ خود اپنے وجود کی شناخت کے لیے قوانین وضع کرتی ہے۔"

اس طرح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قانون زندگی کے لیے ناگزیر ہے اور ضروری ہے۔" انھیں قوانین کے سہارے ارتقاء کا قانون زندگی کو آگے بڑھاتا ہے۔ قانون کی اہمیت اس لیے ہے کہ ہم اسے اصول و نظریہ سمجھتے ہیں۔ اصول ہی کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے جو قانون شکنی کرے اسے صرف اس لیے سزا نہیں ملنی چاہیے کہ دوسروں کو عبرت ہو بلکہ اس کا مقصد دراصل قانون کا اثبات، اس بات کی برتری، اس کی عظمت کا احساس دلانا ہے۔ قانون صرف انھیں افعال و اعمال کی سزا دے سکتا ہے جو سرزد ہوتے ہیں لیکن ان کا اصل محرک جبلّت اور جذبے کا جو رُخ ہے اس پر کوئی قانون روک ٹوک یا احتساب نہیں کر سکتا۔ یہ کام ضمیر کرتا ہے جو شعور کا موضوعی وجود یا احساسِ نفس ہے۔ ضمیر کے اس عمل کے مجموعے کا نام اخلاق ہے[1]۔"

عام دنیوی قوانین و مذہبی قوانین میں یہی فرق ہے کہ دنیوی قانون، قانون توڑنے والے کو سزا دے سکتا ہے لیکن قانون پر عمل کرنے والوں کو جزا نہیں دے سکتا۔ مذہب میں قانون شکنی پر یقیناً سزا ہے اور قانون پر عمل کرنے کے نتیجے میں جزا اور انعام ہے۔

دنیوی قوانین انسانی نیّت کو نہیں دیکھتے اور اس طرح آدمی کی سوچ یا فکر پر کوئی انعام نہیں ملتا۔ مذہبی قانون نیت کی جزا دیتا ہے۔ لیکن اگر فکر درست نہ ہو اور صراطِ مستقیم

---

[1] بحوالہ" اُردو ادب میں فلسفیانہ افکار" غیر مطبوعہ پروفیسر مجاور حسین رضوی۔ ص ۵۱۵۔

کی بجائے "ولا الضالین" والی فکر ہو تو اس پر تنبیہ ہے مگر سزا نہیں۔ انسانوں کے بنائے قوانین یا نظریات کے پاس نیت کا کوئی تصور نہیں ہے جب کہ مذہب نے کہا انّما الاعمال بالنیّات۔ فلسفی بھی نیت کی اہمیت کا قائل ہے چناں چہ کانٹ کہتا ہے۔ "ذہانت، ذکاوت، عدل اور دوسری ذہنی صلاحیتیں یا ہمّت، استقلال، تحمّل یقیناً اچھی ہیں، پسندیدہ ہیں لیکن فطرت کے یہ عطیات بہت خراب اور مفسدانہ ہو سکتے ہیں۔ اگر نیت یا ارادہ جو ان سے کام لینا چاہتا ہے وہ ٹھیک نہ ہو۔ یہی بات دوسری صفات کے لیے بھی کہی جا سکتی ہیں۔ اچھی نیت بذاتِ خود اچھی ہوتی ہے[1]۔"

مذہبی قانون کا مدار نیت پر ہوتا ہے۔ انسانی افعال و اعمال کی پرکھ بھی نیت پر کی جاتی ہے بہر حال کچھ بھی ہو انسانی زندگی میں قانون کی برتری ناگزیر ہے بغیر اصول یا قانون کے زندگی نہیں گزاری جا سکتی ورنہ انتشار اور تصادم میں انسان فنا بھی ہو سکتا ہے اور فساد کا سبب بھی بن سکتا ہے اس لیے زندگی کے لیے قانون ضروری ہے۔

اس قانون کو دو[2] صورتوں میں برتا جا سکتا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ قوانین خود انسانوں کے بنائے ہوئے ہوں ان کا تعلق روزانہ زندگی کے ان مسائل سے ہو جو تغیرات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں مثلاً سڑک پر چلنے کا قانون، کچھ جگہوں پر بائیں طرف، کچھ جگہوں پر دائیں طرف چلنے کا حکم ہے لیکن زندگی کے بنیادی تصورات کے لیے اگر خود انسانوں کا بنایا ہوا قانون ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہ قانون ناقص ہوگا اور متغیر ہوگا۔ اقبالؔ نے لینن کی زبان سے تقریباً ساٹھ برس پہلے یہ معرکہ خیز شعر کہا تھا ؎

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات!

انسانی عقل و خرد تغیّر پذیر رہتی ہے اس لیے اس کے بنائے ہوئے قوانین میں

Introductory reading in Philosophy
By Aurom Stroll H. Popkin P. 516

ترمیم وتغیّر ہوتا رہتا ہے اور یہ قوانین چوں کہ ناقص اذہان کی تخلیق ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں نقص ہوتا ہے۔ اس طرح کے قوانین کبھی کسی دستور کے تحت بنائے جاتے ہیں اور کبھی کچھ قوانین کا توضیحی پہلو رکھتے ہوئے ضمنی رُخ رکھتے ہیں جنھیں (BY Laws) بائی لاز کہا جاتا ہے ان قوانین کی بنیاد پر جو فکر ہوگی وہ نظریہ یا تصوّر ہوگی اسے مذہب نہیں کہہ سکتے۔

(۲) مذہب ان قوانین کا مجموعہ ہے جو عالمگیر حیثیت رکھتے ہیں۔ جو دوسرے نظریات سے اس لیے الگ ہوتے ہیں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین صرف اسی زندگی تک ہوتے ہیں جب کہ تمام مذاہب کے قوانین حیات بعدالموت کا تصوّر رکھتے ہیں۔ بدھ مذہب جس کے پاس خدا کا کوئی تصوّر نہیں ہے وہ بھی روح کو "آواگمن" کے چکّر سے نجات دلانے کے لیے آٹھ اُصول بتاتا ہے۔

اس طرح بلاکسی استثناء کے مذہب اسے کہتے ہیں جس کی بنیاد انسان کے بنائے ہوئے قوانین پر نہ ہو۔ دوم وہ قوانین عالمگیر ہوں سوم وہ قوانین صرف اسی زندگی سے متعلق نہ ہوں بلکہ زندگی کے سفر کے اختتام سے ان قوانین کی منزل شروع ہوتی ہے۔ عموماً مذاہب میں اس زندگی پر جو موت کے بعد شروع ہوتی ہے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ جنّت، جہنّم، جزا، سزا، قیامت، دیولوک، سورگ، نرک، یہ سارے تصوّرات حیات بعدالموت ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔

مذہب کا قانون اس کی مقدس کتاب میں درج ہوتا ہے اور یہ کتاب انسانی تخلیق نہیں ہوتی بلکہ الہٰی قوانین کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ قوانین ہر طرح کے تغیّرات سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ان میں ترمیم و تنسیخ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کوئی مجلس قانون ساز اس پر تبصرہ نہیں کر سکتی۔ صرف الہٰی نمایندہ اللہ کے حکم سے اس میں اضافہ کر سکتا ہے اور کسی حکم کو منسوخ کر سکتا ہے۔ مذہب طرزِ بندگی ہی نہیں طرزِ زندگی بھی سکھاتا ہے۔

اس طرح مذہب اور مذہبی قوانین انسانی زندگی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہزارہا برس کی تاریخ میں انسان انھی مذہبی قوانین کے سہارے اپنی زندگی کو سنوارتا اور نکھارتا رہا ہے۔ ان مذاہب میں سب سے اہم مذہب اسلام ہے۔

اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کی عددی طاقت دنیا کے تمام مذاہب سے اب زیادہ ہے اور اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے ماننے والے دُنیا کے ہر حصّے میں موجود ہیں اور اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ گذشتہ مذاہب کی تصدیق و توثیق کرتا ہے۔ اس کے قوانین بہت آسان اور قابلِ عمل ہیں اور اس کے فکری نظام کا ڈھانچہ ہر دور کے لیے قابلِ قبول رہا ہے اور ہے اور رہے گا۔

اُستاد محترم پروفیسر مجاور حسین رضوی اپنی کتاب "اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر" میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

"بانیٔ اسلام کی پیدائش ۵۷۱ء میں اور اسلام کا آغاز ۶۱۰ء سے ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے دراصل یہ گذشتہ مذاہب کی تصدیق کرکے اور ان کے اچھے اصولوں کی جامعیت کے ساتھ ایک نیا ضابطہ پیش کرتا ہے۔ اسلام عقائد اور عمل کا مذہب ہے۔ اسلام صرف واردات قلب کا نام نہیں۔ نہ اس کیفیت کا نام ہے جو دل پر گزرتی ہے بلکہ اسلام کا ایک مکمل ضابطۂ حیات اور مبسوط نظام زندگی ہے جس کے حیطۂ عمل میں زندگی کا ہر گوشہ داخل ہے۔

اسلام میں سوسائٹی یا سماج کا ایک ایسا نظریہ پیش کیا گیا ہے جس میں فرد، جماعت سے وابستہ بھی رہے اور اپنی شخصیت کے مدارج کی تکمیل بھی کر سکے، اسلام اس طرح سے حقوق و فرائض کے ادا کرنے کا نام ہے جنھیں تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) حق اللہ یعنی بندے پر خدا کی طرف سے عائد کیے گئے حقوق جنھیں بہ حیثیت فرض بندے کو پورا کرنا ہے۔ (۲) حق العباد، بندوں کے بندوں پر حقوق (۳) حق النفس، یعنی ایک فرد پر خود اس کے اپنے حقوق۔

اسلام کا فلسفیانہ پہلو بھی بہت سادہ اور عام فہم ہے۔ خالق قادرِ مطلق ہے۔ بندے کا فرض اس کی رضا حاصل کرنا ہے۔ اس کی صفات عین ذات ہیں۔ بندوں کو سمجھانے کے لیے صفات کا بیان اس طرح کیا گیا ہے کہ جو کمال بندوں میں پائے جاتے ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ لیکن اس کی تشریح کردی گئی ہے بندوں کی صفات

کا اس پر اطلاق کرنا نامناسب ہے۔

بندے اپنے افعال میں خود مختار ہیں جو جیسا عمل کرے گا اسی اعتبار سے اُسے سزا یا جزا ملے گی۔ دُنیا دارالعمل ہے اور ان اعمال کی باز پُرس مرنے کے بعد ہوگی اور یہ موت صرف ایک عارضی وقفہ ہے۔ حیات ابدی موت کے بعد حاصل ہوگی۔ جن لوگوں نے حق اللہ ادا نہیں کیا ان کو معاف کرنا یا سزا دینے کا حق پروردگار عالم کو ہے، لیکن جن لوگوں نے حق العباد ادا نہیں کیا ان کے سلسلے میں خاصی سختی ہے۔ انسانوں کے باہمی رشتے استوار کرنے کے لیے جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں انھیں پورا کیا جائے ورنہ انسان خدا کی نظر میں بھی سزا کا مستحق ہوگا۔ خالقِ کائنات اسے معاف نہیں کرے گا۔ دین کے معاملے میں کسی پر جبر نہیں ہے اور تعظیم و تکریم کے مستحق صرف وہ ہیں جو متقی ہیں یعنی علم یا دولت یا دنیاوی عزت و شہرت معیارِ زندگی نہیں۔ بدھ مذہب نے دنیا کو دکھوں سے بھرا دیکھا۔ اسلام نے اس کائنات کو عطیۂ الٰہی قرار دیا ہے۔ خوبصورت، حسین اور معتدل دنیا جو رہبانیت کی مکمل نفی ہے اور یہاں کے دکھ و درد، رنج و محن دراصل بندے کا امتحان ہیں[1]۔"

اسلام کے اس مختصر سے تعارف کے بعد یہ عرض کرنا ہے کہ اسلامی قوانین مستحکم اور ضابطۂ تحریر میں ہیں ان تمام قوانین کا ماخذ اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔

قرآن اللہ کا کلام ہے جو لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔ خاتم النبیین سیدالکونین کے اوپر یہ قرآن بتدریج وحی کے ذریعے نازل ہوا۔ پہلی وحی غارِ حرا میں سورۂ علق کی ابتدائی آیتیں تھیں[2]۔ اس کے بعد ضرورت و حالات کے لحاظ سے کبھی مکمل سورہ اور کبھی چند

---

[1] "اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر" از پروفیسر مجاور حسین رضوی ص ۴۹، ۵۰۔

[2] بعض مفسرین کے نزدیک سورہ فاتحہ پہلی سورہ اور اس کی آیتیں ابتدائی آیتیں ہیں۔ چنانچہ "ترجمان القرآن" میں مولینا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں "سورہ فاتحہ قطعاً مکی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ابومیسرہ، حسن قتادہ اور ابوالعالیہ وغیرہ کبار صحابہ و تابعین کا یہی مذہب

(باقی اگلے صفحہ پر)

آیتیں نازل ہوئیں۔ جو سورۃ مکہ میں اُتری انھیں مکّی اور مدینہ میں نازل ہوئی انھیں مدنی کہتے ہیں۔

چوں کہ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰؐ تمام عالم کے لیے اور قیامت تک کے لیے رسول بناکر بھیجے گئے ہیں اس لیے دستور کی یہ کتاب بھی آپؐ کے ہی شایانِ شان رکھی گئی۔ یہ کتاب کنزالعلوم بھی ہے اور معارفِ رموزِ الٰہی کا مخزن بھی۔ دستور حیات بھی اور قانون الٰہیہ کا جامع اصول بھی۔ اس کے ذریعے ہم ہر قرن میں دین و دنیوی فلاح و سعادت کے منازل طے کرتے رہیں گے اور انسانی عظمت و رفعت کے بلند مراتب حاصل کرسکیں گے۔ تزکیۂ ظاہر و باطن حاصل کرکے اخلاقی گرانقدر خوبیاں پیدا کرلیں گے۔ انفرادی اور اجتماعی مشکلات کو حل کرسکیں گے۔

اس کامل دستور کے ساتھ اقتصادی، معاشی اور معاشرتی پریشانیوں کو حل کرکے اطمینان اور راحت، عزت و سکون کی زندگی گزاری جاسکتی ہے اور اسی دستور سے عدل و انصاف کے طریقے اور حکمرانی کے قوانین کا استخراج و استنباط کیا جاسکتا ہے۔

اس کامل ترین کتاب کی شان خود پروردگار عالم نے نہایت پرعظمت انداز سے بیان کردی ہے ارشاد ہے اللہ نزّلَ احسن الحدیث کتاباً متشابھاً ومثانی تقشعرّمنہ جلود الّذین یخشون ربّھم ثم تلین جلودھم وقلوبھم الیٰ ذکر اللہ، ذٰلک ھدی اللہ یھدی بہ من یشاءُ ومن یضلل اللہ فمالہٗ مِن ھادٍ۔ اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام اس کتاب کی شکل میں نازل کیا ہے جس کی

(بقیہ) ہے اور حضرت علیؓ نے بھی اس کی تصریح کی ہے حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ سورۂ فاتحہ مکہ میں اُتری بالعموم تمام علماء و مفسرین محققین کی جماعت اسی طرف گئی ہے۔ حافظ سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے" اکثر اس پر ہیں کہ یہ مکّی ہے بلکہ یہ بھی آیا ہے کہ یہی سب سے پہلے اُتری"۔ متقدمین و متاخرین میں امام ابن جریر اور حافظ ابن کثیر جیسے ائمہ تفسیر بالحدیث کا بھی یہی مذہب ہے اور ان دونوں کے بعد کسی اور قال و قیل، قیاس و رائے کی طرف اعتنا کرنے کی ضرورت نہیں۔ صـ ۷۲، ۷۳۔ "ترجمان القرآن"

آیتیں آپس میں ملتی جلتی ہیں اور بار بار دہرائی گئی ہیں کہ ان سے خوفِ خدا رکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اس کے بعد ان کے جسم اور دل یادِ خدا کے لیے نرم ہو جاتے ہیں. یہ اللہ کی واقعی ہدایت ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے اور جس کو وہ گمراہی میں چھوڑ دے اس کا کوئی ہدایت کرنے والا نہیں۔[1]"

سورہ کہف کی پہلی آیت ہے. الحمد للہ الذی انزل علیٰ عبدہ الکتاب ولم یجعل لہٗ عوجًا ؕ ساری تعریف اس خدا کے لیے ہے جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر یہ کتاب نازل کی ہے اور اس میں کسی طرح کی کجی نہیں رکھی ہے۔[2]"

قرآن کریم کی یہ شان جامعیت اور تمام عالم کے واسطے دستور ہونا حضرت علی ابن ابی طالبؓ بزبان رسول اکرمؐ اس طرح بیان فرما رہے ہیں۔ "فرمایا نبی کریمؐ نے کہ اللہ کی کتاب جس میں خبریں ہیں تم سے پہلوں کی۔ احوال و واقعات ہیں ان کے بھی جو تم سے بعد آنے والے ہیں۔ اور یہ کتاب الٰہی فیصلہ ہے تمہارے درمیان ہر خصومت و معاملہ کے لیے جو ایک قانون محکم ہے۔ یہ کتاب الٰہی کوئی لغو اور مذاق جیسی چیز نہیں ہے۔ جو شخص اس کو قساوت قلبی اور نخوت و تکبّر کی وجہ سے چھوڑے گا حق تعالیٰ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا اور جو شخص ہدایت اس کے سوا کسی اور چیز میں تلاش کرے گا اللہ اس کو گمراہ کر دے گا۔ یہ کتاب اللہ، اللہ کی مضبوط رسّی ہے اور یہی اللہ کا محکم ذکر اور بیان ہے اور یہی سیدھا راستہ ہے۔ یہ قرآن اللہ کی وہ ہدایت ہے کہ لوگوں کی خواہشات اس کو ٹیڑھا نہیں کر سکتیں۔ (یا اس کی پیروی کرتے ہوئے لوگوں کی خواہشات اور افکار بے راہ نہیں ہو سکتے) اور نہ لوگوں کی زبانیں اس کو ملتبس کر سکتی ہیں کہ اس کے ذریعے حق اور باطل میں کوئی امتیاز و فرق نہ کیا جا سکے۔ یا یہ کہ زبانیں قرآن کریم کا تلفظ و تکلّم کرنے میں ملتبس نہیں ہو سکتیں۔ (کہ یہ نہ معلوم ہو سکے کہ یہ زبان حق بول رہی ہے یا باطل کا تلفظ کر رہی ہے) بلکہ جو زبان قرآن کی مطابقت کے ساتھ ناطق ہے

---

[1] قرآنِ حکیم سورہ زمر آیت ۲۳۔ [2] سورہ کہف آیت ۱۔

حق ہی ہے اور یہ قرآن ایسا کلام ہے کہ علماء اس سے کبھی سیر نہیں ہوسکتے اور نہ وہ بار بار پڑھنے سے پُرانا دبوسیدہ ہوسکتا ہے۔ بلکہ بار بار جب بھی تلاوت کی جائے اس کی حلاوت ولذت اسی طرح باقی رہے گی بلکہ جس قدر کثرت سے پڑھا جائے گا ہر مرتبہ ایک نیا لطف اور مزہ اربابِ ذوق کو محسوس ہوگا اور نہ ہی اس کے عجائب (معارف وحقائق) کبھی ختم ہوں گے۔[1]"

دنیا میں خواہ کتنے ہی انقلابات اور تغیرات پیش آئیں۔ حکومتیں بدلیں، عادات، رواج اور مزاج بدل جائیں، نئے نئے تقاضے اور ضرورتیں پیش آتی رہیں کسی بھی مرحلہ پر انسان اس دستورِ الٰہی اور قیامت تک رہنمائی کرنے والے محکم قانون میں کسی نوع کی کمی نہیں پائے گا۔ قرآن کریم کے جامع اور محکم اصول ہر مسئلہ اور ضرورت کا حل انسانی حیات کو عطا کرتے ہوئے اس اعلان خداوندی کی تصدیق کرتے جائیں گے۔ مافرطنا فی الکتاب مِن شیئ۔ یعنی "ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔[2]"

قرآن مجید کی آیتیں ایسا معجزہ ہیں اور ایسے اونچے درجے کا کلام ہے کہ اس کی چھوٹی سی چھوٹی سورہ بلکہ ایک آیت کے مثل بھی کوئی شخص قیامت تک نہیں بنا سکتا۔ یہ اللہ رب العزت کی آخری اور سب سے افضل کتاب ہے۔ دُنیا کے کسی کتاب کو اس طرح ازبر یاد نہیں رکھا گیا۔

قرآن مجید ظاہر و باطن کی پاکیزگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے چھُونے کے لیے پہلی شرط طہارت ہے یعنی انسان ناپاک نہ ہو۔ اسلام کے نزدیک صرف کپڑے پاک و صاف رکھنا پاکی یا طہارت نہیں ہے۔ پاک ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ظاہر ہو اور طہارت دو رُخ رکھتی ہے ظاہری اور باطنی۔ ظاہری طہارت کے لیے

---

[1] منازل فی العرفان فی علوم القرآن ص ۱۸، ۱۷۔ از محمد سالک کاندھلوی۔

[2] سورۂ انعام، آیت ۳۸۔ منازل فی العرفان فی علوم القرآن ص ۲۰۔

ضروری وضو ہے اور باطنی طہارت کے لیے نیت اور تقرب الٰہی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں یعنی نیت کی اور غسل نہیں کیا یا وضو نہیں کیا تو طاہر نہیں ہوسکتا اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن حکیم کو مس کرنے کے لیے طہارت ظاہری و باطنی دونوں ناگزیر ہیں۔ اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو طہارت نفس سے آشنا ہو۔

ارشاد ربانی ہے ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطھرین۔ "بے شک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور پسند کرتا ہے ان لوگوں کو جو پاکی اختیار کرنے والے ہیں[1]"۔ اس آیت مبارکہ میں توبہ کے عنوان سے قلب اور باطن کی پاکی کا بیان ہے متطہرین سے ظاہری پاکی مراد ہے چنانچہ وضو کے بعد ہم کلمۂ شہادت اور یہ دُعا پڑھتے ہیں اللھم اجعلنی من التوابین و اجعلنی من المتطھرین۔

یہی وہ طہارت و پاکی ہے جس کے ذریعے انسان جنت میں جائے گا۔ قرآن زبان، کان، آنکھ، قلب و دماغ تک کی طہارت کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی طرح غصہ، غضب، شہوت، تکبر و غرور جیسی برائیوں سے روکتا ہے۔ نماز، روزہ جیسی عبادتوں سے جسم مشقت اٹھاتا ہے جب کہ صدقات، قربانی، و زکوٰۃ کے ذریعے مال کی تطہیر ہوتی ہے۔

قرآن انسان کو توکل کی تعلیم دیتا ہے۔ نعمتوں پر شکر ادا کرنا بتاتا ہے مصائب و حادثات میں صبر کرنا سکھاتا ہے۔ قرآن صداقت و راستی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ زہد، تقویٰ، قناعت قرآن کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ قرآن تواضع، انکساری، توبہ، استغفار کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن ایک دوسرے کو معاف کرنا، درگزر کرنا سکھاتا ہے۔ ماں باپ سے حسن سلوک، پڑوسیوں اور دوست احباب سے ہمدردی و صلہ رحمی کا پیغام دیتا ہے۔ قرآن ساری دنیا میں امن کا نقیب ہے۔ قرآن خالق و

---

[1] سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۲۲۔

مخلوق سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ قرآن ہر غم سے نجات کا طریقہ سمجھاتا ہے۔ قران آدابِ زندگی سکھاتا ہے۔ قرآن صحیح منزل کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن دوزخ و جنت کے حقائق بیان کرتا ہے۔ قرآن انسان و کائنات کے راز کو فاش کرتا ہے، قرآن دنیا کی تخلیق کے مقصد کو واضح کرتا ہے۔ حرام و حلال کی تمیز سکھاتا ہے۔ اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن تمام مسلمانوں کو بھائی قرار دیتا ہے۔ قرآن عدل و انصاف کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن ہمارے لیے شفاء ہے۔ غرض قرآن سارے جہاں کے لیے رحمت ہے۔ قرآن غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن کے ذریعے انسان اپنے پروردگار تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ قرآن انسانی فکر تک کی تطہیر کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ "جسے تم خراب سمجھتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تمھارے بھلائی کے لیے ہو اور جسے تم پسند کرتے ہو، ہو سکتا ہے اس میں تمھارے لیے شر ہو۔"[1]

اس طرح اگر غور کیا جائے تو قرآن حکیم انسانی زندگی کے ہر پہلو کو پیش کرتے ہوئے بندگی کے آداب سکھاتا ہے۔ ابھی یہ عرض کیا گیا کہ قرآن تمام مسلمانوں کو یا ایمان لانے والوں کو آپس میں بھائی چارے کا سبق دیتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن حکیم دنیا کے تمام انسانوں کے لیے بلکہ ہر وجود کے لیے راہِ نجات بتاتا ہے۔ ہم جیسے ہی پڑھتے ہیں۔ الحمد للہِ ربِ العالمین۔ ساری تعریف عالمین کے رب کے لیے ہے تو ہمیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ عالمین میں صرف مسلمین نہیں، صرف انسان ہی نہیں بلکہ انسان و حیوان کے ساتھ شجر و حجر بھی ہیں۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی زندگی قوانین کی پابند ہے اور یہ قوانین قرآن حکیم میں ہیں اور قرآن احسن الخالقین کی سب سے اہم تخلیق ہے۔ اس تخلیق نے حیات انسانی کو ایک جہت اور سمت عطا کی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں انسانی رجحان کے جتنے بھی رُخ ہو سکتے ہیں ان کا تذکرہ ہے یہاں تک کہ شاعری کا بھی ذکر

---

[1] سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۱۶۔

ہے۔ شعرو شعراء کا بھی ذکر ہے۔

چنانچہ سورہ شعراء کے متعلق مفسرین نے لکھا ہے کہ کفار اور مشرکین نے قرآن حکیم کو بے اثر بنانے کے لیے یہ شبہ پیدا کیا کہ یہ ایک طرح کی شاعری ہے جس نے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا۔ رب العالمین نے اس امر کی تردید کرتے ہوئے شعراء اور مرسلین کے فرق کو واضح کیا کہ شعراء کا اتباع کرنے والے گمراہ ہوتے ہیں اور مرسلین کا اتباع صرف صاحبِ ایمان و کردار ہی کرتے ہیں۔

شعراء ہر وادیٔ خیال سے باتیں اکٹھا کرتے ہیں اور مرسلین کے بیان کی بنیاد حقائق پر استوار ہوتی ہے۔ شعراء جو کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی وہ عملی بات ہوتی ہے اور مرسلین پہلے عمل کرتے ہیں پھر اس کے بعد دوسروں کو دعوت عمل دیتے ہیں۔

واضح رہے کہ ان شعراء سے مراد صاحبان ایمان و کردار شعراء نہیں ہیں جن کا استثناء خود آیت کریمہ میں موجود ہے کہ جو صاحبان ایمان و کردار کثرت سے ذکر خدا کرنے والے ہیں اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والے ہیں وہ شعراء قابل مدح و ستائش ہیں اور ان کا مرتبہ مجاہدین راہ خدا کا ہے کہ جہاد کبھی تلوار سے ہوتا ہے اور کبھی اشعار سے بھی ہوتا ہے[1]

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شعری تخلیق کی نہ ممانعت کی گئی ہے اور نہ اس سے روکا گیا ہے بلکہ یہ ایک مستحسن فعل ہے اور یہیں سے بلاغتِ قرآن معجزے

---

[1] والشعراء یتبعھم الغاوٗن ۝ الم تر انھم فی کل وادٍ یّھیمون ۝ وَ انھم یقولون مالا یفعلون ۝ الا الّذین آمنو وعملوا الصاحت وذکروا اللہ کثیراً وانتصروا من بعد ما ظلموا وسیعلم الّذین ظلموا ایّ منقلبٍ ینقلبون ۝ سورہ شعراء آیت ۲۲۴ تا ۲۲۷۔ "شاعروں کی پیروی وہی کرتے ہیں جو بہکے ہوئے ہوں، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ شاعر ایک ایک جنگل میں سر ٹکراتے پھرتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔ اور بکثرت اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا اور اپنی مظلومی کے بعد انتقام لیا جنھوں نے ظلم کیا ہے وہ بھی ابھی جان لیں گے کہ کس کروٹ اُلٹتے ہیں۔"

کی طرح انسانی ذہن کو منوّر اور منجلی کرتی ہے یعنی جس طرح ہم اپنے اپنے معیار کے مطابق شاعری کے اچھے اور بُرے ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں قرآن حکیم نے بھی ایک معیار بتا دیا ہے۔

وہ صاحبِ ایمان ہو۔ یہ شرط بذاتِ خود کثیر الجہات ہے اس لیے کہ جو ایمان لایا وہ زندگی میں ایک مقصد اور سمت کا قائل ہوگا اس کے پاس ضبط و نظم اور تنظیم ہوگی وہ نفس، طبیعت کا مالک اور صاحبِ جمال و جلال ہوگا۔ جہاں سخت ہونا چاہیے وہاں سخت اور جہاں نرم ہونا چاہیے وہاں نرم ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن![1]

اور اگر شاعری اس کی شخصیت کی آئینہ دار ہے تو وہ شاعری جلال و جمال کا پیکر ہوگی اگر وہ اپنی شعری تخلیق کے ذریعے اپنی شخصیت سے دیگر کوئی نمونہ پیش کرنا چاہتا ہے تو وہ نمونہ بھی تخلیق کا اعلیٰ ترین وصف لیے ہوئے ہوگا اور اس میں وہ سارے پہلو موجود ہوں گے جن سے انسانی سماج میں حُسن پیدا ہو سکتا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آج کے دور میں جمالیات کی ایک تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ تخلیق فن اشیاء کے حسن کو نہیں پیش کرتی بلکہ اشیاء کو حسین بناتی ہے اور بہت پہلے قرآن حکیم نے اس طرف متوجہ کیا تھا اور "اچھا کام کیئے" کے استعارے سے یہ سمجھا دیا تھا کہ ہر اچھا کام زندگی کو حسین سے حسین تر بناتا ہے۔

خوبصورت بنانے کے اس عمل میں ذکرِ الٰہی سے غفلت ممکن نہیں ہے بلکہ کثرت سے ذکر ہونا چاہیئے یہ ذکر تقریری بھی ہو سکتا ہے اور تحریری بھی۔ اور اس کا عملی رُخ بھی ہو سکتا ہے۔

اس طرح شعراء اگر ان صفات سے متصف ہیں تو قرآن حکیم کی نظر میں وہ لائقِ

---

[1] ضربِ کلیم "مومن" ص ۴۱ ۔ اقبال۔

صد ستائش ہیں۔

ادبی جمالیات میں تشبیہ اور استعارے، علامتیں، تلمیحات اور آرکیٹائپ کا نہایت اہم مقام ہے بلکہ اگر یہ نہ ہو تو کلام صرف بیان ہوکر رہ جاتا ہے اس سے اثر پذیری رخصت ہو جاتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے نہ صرف یہ کہ بہترین تشبیہات اور استعارات[1] کے ذریعے انسانوں کو سمجھایا ہے بلکہ ایک قصے میں استعارے اور علامت کے ذریعے تخلیق فن کے آداب کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ چنانچہ سورہ یوسفؑ جو بہترین قصہ ہے اس کی کچھ علامتیں اور استعارے درج کیے جا رہے ہیں۔

(۱) جناب یوسفؑ نے اپنی پیغمبرانہ تعبیر سے ان استعاروں اور علامتوں کے معنی بھی واضح کر دیے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت یوسفؑ نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے اور آفتاب و مہتاب ان کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔ اس کی تعبیر یہ تھی کہ ماں باپ بھائی ان کے سامنے خضوع سے پیش آنے والے ہیں[2]۔ (یعقوبؑ کی پہلی بیوی لیاؔ سے چھ اولاد تھی دوسری بیوی روحیل سے دو بیٹے یوسف اور بن یامین تھے باقی سب کنیزوں کی اولاد تھے)۔

دوسری مثال قید خانے کی ہے۔ حضرت یوسفؑ جب قید خانے میں تھے ان کے ساتھ اور دو نوجوان داخل ہوئے۔ ایک نے کہا کہ میں نے خواب میں اپنے آپ کو شراب نچوڑتے دیکھا ہے اور دوسرے نے کہا کہ میں اپنے سر پر روٹیاں لادے ہوئے ہوں اور

---

[1] شہد کی مکھی سورہ نحل پ ۱۴۔ وما امر الساعۃ الا کلمح البصر او ھو اقرب۔ "اور قیامت کا کام تو ایسا ہے جیسے لپک نگاہ یا اس سے بھی قریب"! اسی طرح مکڑا۔ سورہ عنکبوت میں پ ۲۰۔ آیت ۴۱ وغیرہ۔

[2] اذ قال یوسف لابیہ یا بت انی رایت احد عشر کوکبا والشمس والقمر رأیتھم لی سجدین آیت نمبر ۴۔ سورہ یوسف۔ "جب کہ یوسف نے اپنے باپ سے ذکر کیا کہ ابا، میں نے گیارہ ستاروں کو اور سورج چاند کو یہ دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔

اور پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے ان خوابوں کی تعبیر یہ بتلائی کہ تم میں سے ایک (یعنی شراب نچوڑنے والا) اپنے مالک کو شراب پلائے گا اور دوسرا سُولی پر لٹکایا جائے گا اور پرندے اس کے سر سے نوچ نوچ کر کھائیں گے۔[1]

اور پھر ایک روز بادشاہ نے خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں جنھیں سات دُبلی پتلی گائیں کھائے جا رہی ہیں اور سات ہری تازی بالیاں دیکھی ہیں اور سات خشک بالیاں۔ حضرت یوسفؑ نے اس خواب کی تعبیر یہ بتلائی تم لوگ سات سال مسلسل زراعت کرو گے جو غلہ پیدا ہو اسے بالیوں سمیت رکھ دینا۔ علاوہ تھوڑی مقدار کے جو تمھارے کھانے کے کام آئیں۔ اس کے بعد سات برس سخت آئیں گے جو تمھارے ذخیرے کو کھائیں گے علاوہ اس تھوڑے مال کو جو تم نے بچا رکھا ہے۔ اس کے بعد ایک سال آئے گا جن میں لوگوں کی فریاد رسی کی جائے گی اور بارش ہوگی اور لوگ خوب انگور نچوڑیں گے۔

دراصل موٹی گائیں سر سبز شاداب سال ہیں اور دُبلی گائیں قحط کے سال ہیں۔ یہی حال ہری اور خشک بالیوں کا ہے اس کے بعد قحط سے مقابلہ کرنے کی ترکیب بتائی۔[2]

---

[1] سورہ یوسف آیت نمبر ۳۶، ۴۱ ودخل معه السجن فتیٰن قال احدهما انی ارانی اعصر خمراً وقال الاٰخر انی ارانی احمل فوق راسی خبزاً تاکل الطیر منه نبئنا بتاویله انا نرٰك من المحسنین (۳۶)" اس کے ساتھ ہی دو اور نوجوان بھی جیل خانے میں داخل ہوئے ان میں سے ایک نے کہا میں نے خواب میں اپنے تئیں شراب نچوڑتے دیکھا ہے اور دوسرے نے کہا کہ میں نے اپنے تئیں دیکھا ہے کہ میں اپنے سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں جسے پرندے کھا رہے ہیں۔ ہمیں آپ اس کی تعبیر بتلایئے۔" ۴۱۔ اے میرے قید خانے کے دوستو! تم دونوں میں سے ایک تو اپنے بادشاہ کو شراب پلانے پر مقرر ہو جائے گا لیکن دوسرا سولی دیا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کھائیں گے۔"

[2] سورہ یوسفؑ آیت ۴۳، ۴۷ تا ۴۹ وقال الملك انی ارٰی سبع بقرٰت سمان یاکلهن سبع عجاف" وسبع سنبلٰت خضر واخر یٰبسٰت یٰایها الملا افتونی فی رءیای ان کنتم للرءیا تعبرون ۝ قال تزرعون سبع سنین داباً فما حصدتم فذروه فی سنبله الا قلیلا مما تاکلون ۝ ثم یاتی من بعد ذٰلك سبع شداد یاکلن ما قدمتم لهن الا قلیلا مما تحصنون ۝ ثم یاتی من بعد ذٰلك عام فیه یغاث الناس وفیه یعصرون ۝ ۔

حضرت یوسفؑ نے اپنی پیغمبرانہ عظمت سے خواب کی تعبیر بیان کرتے ہوئے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ہری بالیاں سرسبزی و شادابی کی علامت ہیں جب کہ خشک بالیاں قحط سالی کی علامت ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو خواب اور خواب کی تعبیر ہی دراصل علامت اور استعارہ ہے اس لیے کہ تخلیق کار جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ اس کا تخیّل، اس کا خواب ہوتا ہے اور اپنے اسی خواب کی وضاحت کے لیے وہ لفظوں کا سہارا لیتا ہے۔ وہ جو کہا گیا کہ لفظ کہیں کے بھی ہوں، کسی زباں کے ہوں معنی مستقل بالذات ہوتے ہیں وہ نہیں بدلتے۔ یہی معنی گویا علامتوں کے بادل میں چھپی ہوئی بجلیاں ہیں۔

پروردگار عالم نے جگہ جگہ "مثالوں" کا ذکر کیا۔ یہ مثالیں کہیں علامت ہیں کہیں استعارہ[1]۔

اسی کے ساتھ ساتھ مذہب بالخصوص وہ مذاہب جن کے پاس کتابیں ہیں اور ان کتابوں میں جو واقعات درج ہیں وہ واقعات ان مذہب کے ماننے والوں کے آرکیٹائیپ بن گئے ہیں مثلاً جناب موسیٰؑ کا قصہ ان کے ساتھ "عصا" کا ہونا، "ثعبان

---

[1] مثلاً سورہ عنکبوت میں مکڑی کے گھر کی مثال یا سورہ کہف میں ایک دنیا دار اور ایک دین دار کی مثال۔ آیت ۳۲ تا ۴۱ "انھیں ان دو شخصوں کا حال بھی سُنا دیجیے ان میں سے ایک کو ہم نے دو باغ انگور کے دے رکھے تھے .. .. دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے ایک دن وہ اپنے ساتھی سے کہنے لگا میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور مری عزت بھی زیادہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اب یہ باغ کبھی برباد ہوگا اور کبھی قیامت آئے گی اور آئی بھی تو میں دنیا کی طرح وہاں خوش حال رہوں گا۔ یہ سُن کر اس کے دین دار دوست نے جواب دیا کہ تو اس خدا کے ساتھ کُفر کرتا ہے جس نے تجھے نطفے سے پیدا کیا تو اپنے باغ میں جاتے ہوئے کیوں نہیں کہتا جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ میں اس گھمنڈی دُنیا دار کے سارے مال برباد ہو گئے جو کچھ کہ اس نے باغ پر صَرف کیا تھا سب کو سماوی آفت نے آگھیرا اور وہ ہاتھ ملنے لگا"۔

مبین" دریائے نیل میں راستہ پیدا ہونا، عصا مارنے سے بارہ چشمے کا جاری ہونا۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضر کے واقعے میں "کشتیٔ مسکیں، جانِ پاک، دیوارِ یتیم" کا تذکرہ یا حضرت عیسیٰؑ کا گہوارے میں کلام کرنا اور پھر تمام ملائکہ کا آدم کو سجدہ کرنا، ابلیس کا انکار کرنا وغیرہ یہ اہل کتاب کے آرکیٹائیپ ہیں۔ مذہبی روایات اور تہذیبی عناصر کا جزو اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ عالمی ادبیات میں یہ سارے آرکیٹائیپ اپنے تلازمۂ خیال کے ساتھ ملتے ہیں وہ چاہے ملٹن کی Paradise Cost ہو یا دانتے کی ڈیوائن کامیڈی (Divine Comedy) اُردو میں آرکیٹائیپ کا تصور بالکل جدید ہے۔ ہمارے علم بیان میں اسے تلمیح کہتے ہیں۔ تلمیح اور آرکیٹائیپ میں فرق ہے۔ تلمیح کسی واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے جب کہ آرکیٹائیپ میں رسم ورواج وروایات بھی شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُردو غزل، یا مثنوی وقصیدے، میں تلمیحات کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ بالخصوص غزل میں حضرت موسیٰؑ اور طور کا واقعہ، کہ اس کا تعلق جمال مطلق کے نظارے سے تھا۔ کہیں کہیں اشارۃً حضرت عیسیٰؑ کی مسیحا نفسی کی تلمیح مل جاتی تھی۔ غزلوں میں حضرت یوسفؑ اور زلیخا کے واقعے کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ ہمارے قدیم ادبی سرمائے میں اوّل تو تلمیح کی صنعت بہت کم تھی اور اگر تھی بھی تو بس کوئی ایک معروف لفظ مثلاً "کُن" نظم کردیتے تھے۔ سوداؔ نے عربی ٹکڑوں سے تلمیح کی مگر یہ ایک لفظ کے آگے نہیں ہے۔ البتہ ذوقؔ نے "تشاور فی الامر" کا پورا ٹکڑا نظم کرکے صنعتِ تلمیح کی مثال پیش کی البتہ مرثیوں میں انیسؔ ودبیرؔ کے یہاں صنعت تلمیح کی مثالیں کثرت سے ہیں اور قرآنی آیات کا برمحل اور برجستہ استعمال ہے۔

لیکن اُردو شاعری کے عظیم سرمائے میں مرثیے کو چھوڑکر بقیہ مثالیں چند نگینوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ مرثیوں میں قرآنی آیات کا استعمال اخلاقی اور مذہبی پہلو کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے اور کلام باوقار اور باوزن بناتا ہے لیکن مرثیوں میں قرآنی آیات آرکیٹائیپ کے طور پر نہیں آئے ہیں۔

اُردو شعراء میں اقبال پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قرآنی آیات کو آرکیٹائیپ کے طور

پر استعمال کیا اس کی تشریح آگے کی گئی ہے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قرآنی آیات کے استعمال سے شاعری میں مندرجہ ذیل پہلو ابھرتے ہیں۔

(۱) معانی میں تہہ داری، کثیر الجہتی اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔

(۲) لفظی اعتبار سے صوتی آہنگ کے خوشگوار ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

(۳) ترکیبوں سے زبان میں وسعت کے ساتھ ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے ضمناً یہ عرض کرنا ہے کہ جس کے پاس جتنے الفاظ ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ خیالات ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ لفظ خیال کے ساتھ ہی وجود میں آتا ہے۔

(۴) شاعری میں لہجہ کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے عموماً شاعرانہ لہجہ، نزاکت اور نظافت کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن جلال میں جمال ہوتا ہے وہ قرآن کا اعجاز ہے۔ لہجے میں استناد، عظمت اور تحکم و خطاب یہ قرآن کا اعجاز ہے۔ قرآنی آیات کے کسی رُکن سے استفادہ کرنا یا اس کے معنی سے استفادہ کرنا شاعرانہ لہجہ کو بدل دیتا ہے اور یہی سبب ہے کہ اقبال کا فلسفیانہ کلام باوجود خشک مابعد الطبیعاتی مباحث نہ گراں گزرتا ہے اور ثقیل معلوم ہونے کے بجائے جلیل و جمیل نظر آتا ہے۔

(۵) راقم الحروف مسلمان ہے، قرآن نہ صرف اس کا ایمان ہے بلکہ اس کی لسان بھی ہے اور اس لیے مرے لیے باعث برکت ہے۔ مگر ادبیات کے مطالعے میں یہ ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے کہ ادب کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ بالخصوص اُردو ادب تو ہر مذہب والے کا ہے اور ضروری نہیں ہے کہ دوسرے قارئین کو بھی قرآن بابرکت اور ان کا ایمان معلوم ہو۔ لیکن اس بات سے ہر ایک کو اتفاق ہے اور اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ گذشتہ چودہ سو برس سے زائد عرصے میں یہ عظیم کارنامہ قائم بالذات زندہ اور پائندہ ہے۔ اس کے ساتھ ماضی بھی ہے حال بھی مستقبل بھی۔ یہ قیودِ زماں و مکاں سے آزاد ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کا حوالہ بذات خود ایک نئی شعریات کا

خالق بن جاتا ہے اور اسی لیے جس کسی نے جہاں کہیں بھی قرآن حکیم سے استفادہ کیا اور اس کے کسی رُکن کو الفاظ و مفاہیم کے لیے زینت بنایا وہیں کلام میں عظمت پیدا ہوتی ہے اور اسی عظمت کا احساس ادبی جمالیات کی تخلیق کرتا ہے۔

"ادبی تخلیق شعر میں ہو یا نثر میں، ادب اپنے وجود کے لیے تشبیہہ، استعارہ، علامت اور تخلیقی اظہار کے دیگر محاسن سے آراستہ رہے گا۔ یہی ادبی جمالیات ہے۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں۔ "ادب اور فن کے وہ نمونے جن کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ قدر جمال کے علاوہ کسی اور قدر کے حامل نہیں عموماً ان کی جمالیاتی قدر بھی مشتبہ رہتی ہے۔ حسن خواہ مظہر قدرت میں پایا جائے یا انسانی شخصیت، کردار یا انسانی عمل میں اس کی پہچان تو بہر حال اس جمالیاتی احساس کی مدد سے ہوتی ہے جو ہم کو اس سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ کوئی قابلِ تجزیہ چیز نہیں ہے اور ہمارا احساس حسن اس کے کسی معین مظہر سے وابستہ یا محدود نہیں ہوتا۔ اس بناء پر یہ دعویٰ بے جا نہیں کہ مکمل حسن وہی ہے جو ہمارے جمالیاتی احساس کے ہر تقاضے کو پورا کر سکے اور ہمیں مکمل آسودگی بخش سکے۔ بقول اقبالؔ ؎

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
ایسی ایک کامل تجلّی مُدعا رکھتا ہوں میں[1]

ریاض الحسن لکھتے ہیں۔ "جب ہم کسی خارجی شے کو دیکھتے ہیں تو تخیّل بہ تقاضائے انبساط ایک ایسا خیالی ہیولیٰ قائم کر دیتا ہے جس کی بنیاد اسی خارجی شے پر ہوتی ہے۔ یہ ہیولیٰ سمندر کے کہرے کی طرح اپنی بنیاد سے علیٰحدہ بھی ہوتا ہے اور ملا ہوا بھی۔ یہ گویا روح کا ایک عکس ہے جو خارجی اشیاء پر پڑتا ہے۔ روح کی تمنائیں اور آرزوئیں اسی ہیولیٰ میں نظر آتی ہیں۔ اس ہیولیٰ میں جو روح کا خارجی عکس ہے بیک وقت خارجی اشیاء اور تخیّل اور تصوّر کی کیفیات موجود رہتی ہیں اور اسی ہیولیٰ کا نام حُسن ہے۔ جمالیات کی اصطلاح میں اس

---

[1] ادب میں جمالیاتی اقدار، ایک مطالعہ۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ص ۳۷، ۳۸۔

کو جمالیاتی اظہار کہتے ہیں کیوں کہ روح خود اپنی خواہش جمال کو ایک خیالی ہیولیٰ کے ذریعے ظاہر کرتی ہے۔ اس ہیولیٰ کا اظہار جب رنگ، صورت یا آواز میں ہوتا ہے تو اسی کو فن یا آرٹ کہتے ہیں۔[1]

اس سلسلے میں مشہور مفکر کروچے کے نظریات پر بھی نظر ڈال لینا مفید ہوگا۔ اس لیے کہ جمالیات میں نظریۂ اظہاریت کا سب سے بڑا مبلغ کروچے ہی ہے۔

اس کے خیال میں تاریخ لکھنے والے فلسفی کو کائنات کے مقاصد کا پتہ چلانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ادبی اور تاریخی مطالعہ کی بنیاد پر فلسفہ میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس کے فلسفیانہ تفکر پر تنقید اور جمالیات کی گہری چھاپ ہے وہ نظریۂ حسن" کو مدون کرنے کی کوشش کرتا ہے اور حسن کی تعریف اس کے پاس یہ ہے کہ وہ اظہار کا نام ہے۔ وہ جمالیاتی حس کو تدبر نہیں بلکہ تخلیق سمجھتا ہے وہ الفاظ کو خیالات پر اور خارجی مشاہدات پر داخلی محسوسات کو فوقیت دیتا ہے۔[2]

کروچے کے اس تصور کے ساتھ ہی یہ بحث بھی پیدا ہوتی ہے کہ جمالیاتی حس کیا ہے اور اقبال کے یہاں جمالیاتی حس اور جمالیاتی ذوق کس پہلو سے آئے ہیں، نصیر احمد ناصر نے اپنی کتاب " اقبال اور جمالیات" میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے جستہ جستہ اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

" خارجی شے اپنی ذات میں خوبصورت نہیں ہوتی بلکہ جمالیاتی قدر کے لحاظ سے اس کے حسن کی حیثیت محض اضافی یا خارجی ہوتی ہے۔ فن کا وظیفہ اس لیے فنکار کے وجدانی مشاہدے کو طبیعی مظہر یعنی رنگ، صورت یا آواز میں لانا ہوا۔ اس اعتبار سے اس کا تعلق عمل کے درجے سے ہوا۔ حسن کا ماخذ فنی وجدان ہے چنانچہ جو شخص کسی فن پارے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ گویا خود اپنے فنی وجدان کے حسن کو معرضِ

---

[1] فلسفۂ جمال از ریاض الحسن ص ۶۱۷۔

[2] A History of Philosophy By Ander wedberg

اظہار میں لاتا ہے۔[1]"

"حسن خارج یا معروضات (Objects) میں بھی پایا جاتا ہے لیکن اسے دیکھنے، معلوم اور محسوس کرنے یا دوسرے لفظوں میں جمالیاتی مشاہدہ کے لیے ہمیں دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جنھیں حواس (Sense) اور قلب کہتے ہیں[2]۔"

اس میں شک نہیں کہ ہمارے عام مشاہدے میں ہمارے پانچوں حواس حصہ لیتے ہیں لیکن جہاں تک جمالیاتی مشاہدے کا تعلق ہے اس میں بالخصوص دو حواس یعنی سامعہ اور باصرہ باقی تینوں حواس کی بہ نسبت زیادہ اور اہم حصہ لیتے ہیں لیکن اس سے یہ ہرگز نتیجہ اخذ کرنا نہیں چاہیئے کہ باقی حواس جمالیاتی مشاہدے کے لیے بیکار ہیں یا اس کی تشکیل میں مطلقاً حصہ نہیں لیتے۔ یہ حواس بھی یقیناً جمالیاتی مشاہدے کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں، لیکن خاص کر ان کی اہمیت بہت کم ہے[1]۔"

باصرہ کا وظیفہ مشاہدہ کرنا اور اس کے اثرات کو قلب پر مرتب کرنا ہے۔ اس طرح سامعہ کا وظیفہ سننا اور اس کے اثرات کو قلب پر مرتسم کرنا ہے۔ اس لحاظ سے حواس کی قوتیں فعلی بھی ہوئیں اور انفعالی بھی۔ نیز اس طرح حواس و قلب ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور اثر بھی قبول کرتے ہیں اور دونوں کے تعلق کی نوعیت فعلی اور انفعالی دونوں طرح کی ہے۔ لہٰذا ان دونوں کے تعامل ہی سے حُسن کا احساس و شعور یا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے کئی چیزیں گزر جاتی ہیں مگر ہم کچھ بھی نہیں دیکھتے۔

سونے میں کان تو بدستور کھلے ہوتے ہیں لیکن انسان کچھ نہیں سُنا کرتا ــــ اس طرح جب ہم کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوتے ہیں یا کسی اور طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ہمیں پکارا جاتا ہے تو ہمیں کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قلب کے اشتراکِ عمل کے بغیر کوئی قوتِ حاسہ اپنا وظیفہ سرانجام نہیں دے سکتی ... ... قلب

---

[1] ص ۲۹۹ اقبال اور جمالیات ص ۲۰۳۔ [2] ص ۲۰۵ اقبال اور جمالیات۔

کی توجہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے[1]۔

قلب کی توجہ یا اشتراک عمل کے بغیر کوئی مشاہدہ معتبر نہیں ہو سکتا۔ دل فی الفور اپنے تاثرات کو دماغ کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور دماغ کے فیصلے دل قبول کرے تو ان میں مفاہمت کی صورت پیدا ہو جاتی ہے ورنہ دوسری صورت میں ان میں کشاکش پیدا ہو جاتی ہے[2]۔

قلب کی طرح دل کے بھی دو[2] حصے ہیں۔ احساس اور وجدان، احساس کا تعلق محسوسات سے، وجدان کا وجدانات سے ہوتا ہے۔

وجدان دراصل احساس سے لطیف تر شے ہے اس کا وظیفہ حسن و قبح کے تاثرات قبول کرنا ہے اور اسے جمالیات کی جدید اصطلاح میں جمالیاتی حس سے تعبیر کرتے ہیں۔ جمالیاتی حس تو انسانی فطرت کا خاصہ ہے جب کہ جمالیاتی ذوق کی تخلیق میں مختلف عناصر حصہ لیتے ہیں۔ جن میں قومی عصبیت، وراثت، ماحول، تعلیم و تربیت اور مشاہدہ اہم سمجھے جاتے ہیں۔ جمالیاتی حس میں عالمگیر وحدت اور جمالیاتی ذوق میں ہمہ گیر کثرت و تلمونی پائی جاتی ہے۔

عورت کے معاملے میں دنیا کے کُل فرد اس سے محبت کرتے ہیں وجہ یہ ہے کہ جمالیاتی حس عالمگیر حیثیت رکھتی ہے[3]۔

اس کے برعکس جمالیاتی ذوق چوں کہ وراثت و ماحول اور تعلیم و تربیت وغیرہ عناصر کی تخلیق ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں وحدت کا فقدان ہوتا ہے لہٰذا ہر مرد کو مختلف شکل و صورت، ڈیل و ڈول، رنگ و روپ اور خدوخال کی پسند ہوتی ہے۔ جمالیاتی حس کی حیثیت نوعی اور ذوق انفرادی ہے۔ دیگر حکمائے جمالیات کی طرح اقبال بھی جمالیاتی حس اور جمالیاتی ذوق کے بنیادی فرق سے آگاہ نہیں تھے۔ جس کے باعث وہ بھی ذوق جمال سے جمالیاتی حس ہی مراد لیتے ہیں ؎

---

[1] ایضاً۔ ص ۲۰۶، ص ۲۰۷ ۔ [2] ص ۲۰۸ ۔ [3] ایضاً، ص ۲۱۰، ۲۱۱ ۔

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

وہ مشاہدۂ حُسن کے لیے باصرہ کی بجائے دل کی آنکھ کو ضروری ٹھہراتے ہیں۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشہ کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدہ دل وا کرے کوئی[1]

اگر قلب اپنی اصل حسین حالت پر قائم رہے یا اس کی جمالیاتی قدروں میں اضافہ ہوتا چلا جائے تو اس کی جمالیاتی حِس تیز اور قوّتِ مشاہدہ بتدریج بڑھتی چلی جاتی ہے۔

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگراں اور[2]

احوال و مقامات پر موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور

شیلنگ کے نزدیک فن جمالیاتی فعلیت ہے اور ایک فعلیت جو بیک وقت شعور کی حامل بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی اور وہ فطرت کی طرح بے شعور اور رُوح کی طرح باشعور ہوتی ہے یہی فعلیت ہے جو صحیح معنی میں جمالیاتی فعلیت ہے۔

ہر تخلیقی فعلیت کا مقصد حُسن آفرینی ہی ہوتا ہے۔

لیوبکے (Levecue) کو جمالیات میں اظہار کی اساسی قدروں کا شعور تھا چنانچہ اسی لیے وہ حُسن اور فن دونوں کے "اظہار" کو ایک لازمی شرط قرار دیتا ہے

---

[1] ص ۲۱۰ ایضاً۔ [2] ص ۲۱۳۔ ایضاً۔

اور بار بار اس کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔

فن کی جمالیاتی قدروں کا انحصار خود نوعیت خودی پر ہوتا ہے یعنی اگر خودی کا مقام پست ہے تو اس کا اظہار بھی ادنیٰ اور قبیح ہوگا۔ اس کے برعکس اگر اس کا مقام بلند ہے تو اس کے اظہار میں بھی رفعت و خوبی اور جمال و جلال ہوگا ؎

نمود جس کی فراز خودی سے ہو وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب[1]

اقبال کی شعری جمالیات دراصل اسی شعر سے واضح ہو جاتی ہے وہ حسن جو چمن سے موسم بہار کی طرح روتا ہوا جاتا ہے اور وہ شباب جو سوگوار ہوتا ہے وہ جلوۂ حسن کہ جس کے لیے تمنا بے تاب ہوتی ہے اور جسے آغوش تخیل میں شباب پا لیتا ہے اور جس سے جوانی افسانۂ رنگیں بنتی ہے وہ حسن اقبال کے یہاں ناپایدار ہے اور ازلی مسرت نہیں بخش سکتا۔

اپنے ابتدائی دور میں اقبال یہ قصیدہ پڑھتے رہے

"وہ مست ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے
تو کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے"

لیکن اپنے شعور کی پختگی کے ساتھ انھوں نے خودی میں جمالیات کا مکمل تصور دیکھا۔

غیر خود فرد کے باہر کوئی شے نہیں ہے بلکہ یہ اپنے آزاد اظہار میں اپنا وجود رکھتا ہے، "غیر خود" خود کے لیے اجنبی نہیں بلکہ وابستہ ہے۔

---

[1] اقبال اور جمالیات از نصیر احمد ناصر، ایضاً۔

اقبال کے ہاں بھی قرآنی ارشادات کی روشنی میں "نیچے جاؤ اور تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے"۔ ہر لمحہ اس دنیا میں تصادم ہے۔ جس کا درک زندگی کو تابناک بھی بناتا ہے اور ظلمات میں بھی ڈھکیل دیتا ہے۔ لیکن اقبال کے یہاں یہ جدوجہد اور انتشار بغیر مقصد کے نہیں ہے۔ حقیقت اندھی نہیں ہے۔ حقیقت دوران خالص ہے جس میں خیال، مقصد ایک دوسرے پر اثر انداز ہو کر اسے ایک وحدت بنا دیتے ہیں۔

شوپنہار زندگی کی جدوجہد سے فنی تخلیقات میں فرار ڈھونڈھتا ہے۔ اقبال اس جدوجہد کو تسلیم کرتے ہیں اور اس میں انسان کامل کا ارتقاء تلاش کرتے ہیں۔ اقبال کی نظر میں مصیبت اور دکھ میں صبر انسانیت کی دلیل ہے۔ اقبال پیام مشرق میں شوپنہار کے صحیح تجزیہ اور غلط نتائج پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک پرندہ اپنے آشیانہ سے چمن میں گیا۔ گلاب کے پھول کا ایک کانٹا اس کے جسم میں چبھ گیا۔ پرندہ اپنے اور دوسرے کے غموں پر نغمہ سرا ہوا۔ ہر سحر کی شام ہے اور پھر وہ کانٹا نکل گیا اور گلاب اس کے سینہ کے خون سے سرخ ہو گیا اگر تم اپنے مصائب سے چھٹکارا چاہتے ہو تو کانٹوں سے دوستی کرو تاکہ تم چھٹکارا حاصل کر سکو۔

اس طرح اقبال کی شعری جمالیات میں کانٹے کے رنگ میں بھی سبزہ زار کا لہو ہے اور انھیں وہ گلستاں پسند نہیں جہاں گھات میں صیاد نہ ہو۔ ان کے تصور جمال میں جب تک جلال نہ ہو تب تک اس کی تکمیل نہیں ہوتی اور یہ وجدان نئے اور اچھوتے تصورات رکھتا ہے۔ دونوں کا تعلق خارج سے بھی ہے اور وجدان سے بھی ہے۔

برگساں کہتا ہے۔" وجدان زندگی ہے۔ کائنات میں جو عمل ہے اسے شاعر کی تخلیقی صلاحیت کے مماثل کہا جا سکتا ہے۔ زندہ اور آگے بڑھتی ہوئی ——— سائنس سے زندگی کا تقرب حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف وجدان کے ذریعے ممکن ہے۔ مادہ ایک ایسی مشین کی طرح ہے جس کے پاس حافظہ نہیں ہے۔ ذہن اور شعور ایسی قوت ہے جو بنیادی طور پر آزاد اور حافظے کی مالک ہے۔ تخلیقی قوت جو ماضی پر ماضی کو رکھ کر

لڑھکاتی جاتی ہے اور ہر لمحہ جس میں دوران (وقفہ دوران خالص) اور واقعات کی ترتیب ہوتی ہے اور اس سے کوئی نئی شے وجود میں آتی ہے۔ شعورِ مسلسل تخلیق ہے جو مادے کو نئی شکل دیتی ہے۔ انسان ہی آزاد ہو سکتا ہے۔ انسانی ذہن ضرورت سے ضرورت کا مقابلہ کرتا ہے۔ مادہ رکاوٹ بھی ہے اور محرک بھی اور اسی سے جسم اپنی قوت کا اندازہ کرتے ہیں[1]۔"

اس طرح وقت کا وہ تصور جو فنا اور تخریب کا پیمبر تھا اقبال کے یہاں وہ بقاء اور تخلیق و تعمیر کا علمبردار بن گیا۔ اس کی سب سے اچھی مثال "مسجد قرطبہ" کے دوسرے بند میں مل جاتی ہے۔

اس طرح اقبال کے شعری جمالیات میں جمال کے ساتھ جلال بھی ہے نزاکت کے ساتھ صلابت بھی ہے۔ تخیل کے ساتھ حقیقت بھی ہے اور وہ اپنی شعری جمالیات کی آرائش کے لیے ان استعاروں سے کام لیتے ہیں جن کی جڑیں تاریخ میں پیوست ہیں۔ ان علامتوں اور اشاروں کا سہارا لیتے ہیں جن کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے اور اس طرح ان کی شعری جمالیات میں الفاظ کو نئی معنویت تو ملتی ہی ہے۔ انھیں تقدس اور طہارت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ ایسے تزکیۂ نفس کی طرف لے جاتے ہیں، جو صحیح معنوں میں فرحت بخش ہے اور اسی لیے ان کی شعری جمالیات میں وقت کے سیلِ رواں کے ہاتھوں نہ فنا ہے نہ تغیر بلکہ قرآن حکیم سے مستعار ہونے کی وجہ سے رنگِ ثبات دوام حاصل ہے۔ اب اس روشنی میں یہ دیکھنا ہے کہ اقبال کے اردو کلام پر قرآنی آیات کے اثرات نے کس طرح نئی معنویت پیدا کی ہے۔ آیندہ صفحات میں یہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں یہ پہلو بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اقبال پر قرآن کا اثر رسمی اور روایتی

---

[1] Introduction History of Philosophy
By Frank Thilly P.No. 523, 24, 25

نہیں تھا بلکہ حقیقی تھا وہ اسے صرف مصحف یا ایک کتاب نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی نظر میں قرآن قلب و رُوح کی طہارت کے لیے بھی ضروری تھا اور انفرادی طہارت ہی نہیں اس میں اجتماعی طہارت بھی چھپی ہوئی تھی۔ وہ اپنی شاعری کو ایک طرح سے ملّت آدم کے لیے ایک شاہراہ بنانا چاہتے تھے۔ اس شاہراہ کی تعمیر کے لیے انھوں نے قرآن حکیم سے روشنی حاصل کی تھی۔

اس سے پہلے کہ ان کے کلام پر قرآنی اثرات کی نشاندہی کی جائے۔ نثر میں جوان کے خیالات قرآن سے متعلق تھے اور جس طرح انھوں نے "تشکیل جدید الٰہیات" میں قرآن سے استفادہ کیا اس کی نشاندہی ضروری ہے۔

علامہ اقبال فرماتے تھے:

جب میں ایف۔ اے میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا، والد صاحب مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل ختم کر چکا ہوتا تھا کبھی جاری ہوتی ایک دن آکر پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھتے تھے؟

مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصّہ بھی آگیا۔ چھ مہینے ہو گئے اور ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھتا ہوں پھر یہ سوال کیسا؟ نہایت نرمی سے فرمایا۔ "میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ میں بھی آتا ہے؟" اب مرا استعجاب اور غصّہ جاتا رہا اور کہا کچھ عربی جانتا ہوں کہیں کہیں سمجھ میں آجاتا ہے۔"

بات ختم ہو گئی، کوئی چھ ماہ بعد ایک دن بیٹھ گئے اور فرمایا "بیٹا قرآنِ کریم اس کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر نازل ہوتا ہے۔"

مَیں حیران تھا کہ کیا نبی کریمؐ کے بعد قرآن کریم کسی کی سمجھ میں آہی نہیں سکتا.... فرمایا یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآن کریم حضورؐ کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا۔ میں پھر حیران ہوا تو فرمایا " انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمدؐ کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک ہر نبی میں محمدؐ ہی کے مختلف مدارج تھے وہ سلسلے گویا Mohammad

تکمیل محمدؐ کے منازل تھے بنیادی اصول ہر جگہ تھا البتہ شعور انسانی کے in the making ارتقار کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی حتیٰ کہ محمدؐ مکمل ہوگیا اور باب نبوت بند ہوگیا۔ انسانیت اپنی معراج کبریٰ تک پہنچ گئی۔ اب ہر انسان جتنا محمدیت کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اتنا ہی قرآن اس پر نازل ہوتا جاتا ہے یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا کہ قرآن کریم اس کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

"سیرت اقبال" میں پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے مندرجہ اقتباسات درج کیے ہیں جن سے علامہ اقبال کا قرآن سے شغف کا مزید اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"رئیس الاطباء حکیم محمد حسن قرشی لکھتے ہیں:

"قرآن حکیم سے ان کو بے حد شغف تھا وہ بچپن سے بلند آواز سے قرآن پڑھنے کے عادی تھے قرآن حکیم پڑھتے ہوئے وہ بے حد متاثر معلوم ہوتے تھے۔ آواز بیٹھ جانے کا انھیں سب سے زیادہ قلق یہ تھا کہ وہ قرآن حکیم بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے۔ بیماری کے دنوں میں بھی جب کسی نے قرآن حکیم خوش الحانی سے پڑھا تو آنسو جاری ہوگئے اور ان پر لرزش و اہتزاز کی کیفیت طاری ہوگئی۔

آپ کلام پاک خاص دل سوزی اور شغف کے ساتھ تلاوت کیا کرتے تھے پڑھتے جاتے اور روتے جاتے یہاں تک کہ اوراق مصحف تر بتر ہو جاتے اور ان کو دھوپ میں سُکھایا جاتا۔ آپ کی تلاوت کا خاص قرآن پاک اسلامیہ کالج لاہور کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور اس روایت کا عینی ثبوت فراہم کرتا ہے"۔

مرزا جلال الدین بیرسٹر فرماتے ہیں:

"مطالب قرآنی پر ان کی نظر ہمیشہ رہتی۔ کلام پاک کو پڑھتے تو اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے بلکہ نماز کے دوران میں جب بہ آواز بلند پڑھتے تو وہ آیات قرآن پر فکر کرتے اور ان سے متاثر ہوکر رو پڑتے۔ ڈاکٹر صاحب کی آواز میں ایک

بحوالہ "رسالہ فکر و نظر" اسلام آباد، اگست ۱۹۷۶ء صـ ۱۱۹۔

خاص کشش تھی جب وہ قرآن پاک باآواز بلند پڑھتے تو سُننے والوں کا دل پگھل جاتا۔"

اسلام کی تمام تعلیمات کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اقبال نے اپنے پیام میں قرآن پڑھنے اور اس سے نورِ ہدایت حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔ ایک خط میں اکبرالہ آبادی کو لکھا تھا: "واعظِ قرآن بننے کی اہلیت تو مجھ میں نہیں ہے ہاں اس مطالعے سے میرا اطمینان خاطر روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے[۱]۔"

یہاں بے محل نہ ہوگا اگر ہم قرآن سے متعلق علامہ اقبال کے نظریات کا مزید ذکر کریں۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" یعنی علامہ اقبال کے انگریزی خطبے جو مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں دیئے گئے۔ جناب سید نذیر حسن کی کوشش سے اُردو میں منتقل ہو چکے ہیں، ان خطبات کے دیباچے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں:

" قرآن پاک کا رجحان زیادہ تر اس طرف ہے کہ فکر کے بجائے عمل پر مدار دیا جائے۔ یوں بھی بعض طبائع میں قدرتاً یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ واردات باطن کی اس مخصوص نوع کو جو مذہب کے لیے ایمان و یقین کا سہارا ہے ویسے ہی اپنے تجربے میں لائیں جیسے زندگی کے دوسرے احوال اور اس کائنات کو جسے ہم اپنے آپ سے بیگانہ پاتے ہیں اپنے اندر جذب کرلیں۔ رہا عہدِ حاضر کا انسان سو اسے محسوس یعنی اس قسم کے فکر کی عادت ہوگئی ہے جس کا تعلق اشیا اور حوادث کی دنیا سے ہے اور یہ وہ عادت ہے جس کی اسلام نے اور نہیں تو اپنے تہذیبی نشوونما کے ابتدائی دور میں حمایت کی، لہٰذا وہ ان واردات کا اور بھی اہل نہیں رہا بلکہ انھیں شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کیوں کہ ان میں وہم اور التباس کی پوری پوری گنجائش ہے۔ صحیح قسم کے سلسلہ ہائے تصوف نے تو بے شک ہم مسلمانوں میں مذہبی احوال و واردات کی تشکیل اور رہنمائی میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، لیکن آگے چل کر ان کی نمایندگی جن حضرات کے حصے میں آئی وہ عصر حاضر کے ذہن سے بالکل بے خبر ہیں اور اس لیے وہ

---

[۱] سیرت اقبال - ص ۱۰۰، ۹۹ -

موجودہ دنیا کے افکار و تجربات سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکے۔ وہ آج بھی انہی طریقوں سے کام لے رہے ہیں جو ان لوگوں کے لیے وضع کیے گئے تھے جن کا تہذیبی مطمح نظر بعض اہم پہلوؤں کے لحاظ سے ہمارے مطمح نظر سے بڑا مختلف تھا۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ وما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ (سورہ لقمان) اس آیت کا اشارہ جس حیاتی وحدت کی طرف ہے اگر آج اسے تجربے میں لایا جائے تو کسی ایسے منہاج کی ضرورت ہو گی جو عضویاتی اعتبار سے تو زیادہ سخت ہیں یعنی شدید بدنی ریاضت کا طالب نہ ہو مگر نفسیاتی اعتبار سے اس ذہن کے قریب تر ہو جو گویا محسوس کا خوگر ہو چکا ہے تاکہ وہ اسے آسانی سے قبول کر لے لیکن پھر جب تک ایسا کوئی منہاج شکل نہیں ہو جاتا یہ مطالبہ کیسا غلط ہے کہ مذہب کی بدولت ہمیں جس قسم کا علم حاصل ہوتا ہے اسے سائنس کی زبان میں سمجھا جائے چنانچہ یہی مطالبہ ہے جسے ان خطبات میں ... ... میں نے اسلامی روایات فکر علی ہذا ان ترقیات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو علم انسانی کے مختلف شعبوں میں حال ہی میں رونما ہوئی ہیں! الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید سے ایک حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں بھی یہ وقت اس طرح کے کسی کام کے لیے بڑا مساعد ہے قدیم طبیعات نے خود ہی اپنی بنیادوں کی تنقید کرنا شروع کر دی ہے لہٰذا جس قسم کی مادیت ابتداءً کو اس کے لیے ناگزیر تھی بڑی تیزی سے ناپید ہو رہی ہے اور وہ دن دور نہیں کہ مذہب اور سائنس میں ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہو جو سر دست ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ غور و فکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں جیسے جیسے جہانِ علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے لیے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں کتنے ہی اور (اور شاید ان نظریوں سے جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں زیادہ بہتر) نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہر حال یہ ہے کہ فکر انسانی کے نشوونما پر احتیاط سے نظر رکھیں اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں[1]۔"

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات، ص ۳۸-۳۹ "دیباچہ"

ان تمام تمہیدی کلمات، مباحث، نظریات کے بعد آیندہ صفحات میں اقبال نے اپنے کلام کو جس طرح قرآن سے سنوارا ہے اور جس طرح استفادہ کیا ہے اس کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اقبال کے کلام پر قرآن کے اثرات یا قرآنی آیات سے استفادہ کہیں براہِ راست ہے اور کہیں بالواسطہ۔

کوشش یہ کی گئی ہے کہ "بانگِ درا" سے لے کر "ارمغانِ حجاز" تک جس شعر پر بھی عکس نظر آئے اسے پیش کر دیا جائے۔ اس موضوع پر غلام مصطفےٰ خاں صاحب نے "اقبال اور قرآن" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ راقم الحروف نے اس سے استفادہ کیا ہے لیکن صرف انہی آیات اور اشعار کو لیا گیا ہے جو مبہم یا دور از کار نسبت نہیں رکھتیں۔ یا جن کا تذکرہ بعد میں تفصیل سے کر دیا گیا ہے۔ مثلاً "بانگِ درا" کا آغاز "ہمالہ" سے ہوتا ہے پہلے بند کا پانچواں مصرعہ ہے ع

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے

اس شعر کو اس لیے ابتداء میں نہیں رکھا گیا کیوں کہ کلیم اور طور سینا کا تفصیلی بیان آگے ہے۔ سلسلۂ آغاز "پہاڑ اور گلہری" سے ہے۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

بانگِ درا[1] (ایک پہاڑ اور گلہری)

(۱) آلِ عمران آیت ۱۹۱

ربنا ما خلقت هذا باطلاً ٥

"اے مرے پروردگار تو نے اس دنیا کو بیکار نہیں بنایا۔"

---

[1] ص ۳۱۔ بانگِ درا۔

(۲) آل عمران ۱۹۳

وکفّر عنّا سیّاٰتِنا

اور (اے پروردگار) ہم سے ہماری بُرائیوں کو دُور کر۔

(۳) وما خلقنا السّماء والارض وما بینھما لٰعبین سورہ انبیا آیت ۱۶

"اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ کہ ان کے درمیان ہیں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں۔"

جب یہ دنیا بیکار نہیں تو پھر اس میں نہ کوئی چیز بُری ہو سکتی ہے نہ نکمّی۔

مرے اللہ بُرائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو[1]

بانگِ درا (بچّے کی دعا)

آل عمران آیت ۱۹۳

وکفّر عنّا سیّاٰتِنا

"اور (اے پروردگار) ہم سے ہماری برائیوں کو دُور کر۔"

سورہ فاتحہ آیت ۶

صِراط الّذین انعمت علیھم ٥ غیر المغضوبِ علیھم ولا الضّآلین ٥

"اس راہ پر چلا جس راہ پر تو نے انعام فرمایا نہ ان کی جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کی۔"

متذکرہ شعر سورہ فاتحہ کی آیات کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱) دید سے تسکین پاتا ہے دل مہجور بھی ؟
لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی ؟[2]

(خفتگانِ خاک سے استفسار)

---

[1] ص ۳۴۔ [2] بانگِ درا ص ۳۸۔

(۲) قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل
التجائے ارنی سرخیٔ افسانۂ دل

(دل) بانگِ درا

(۳) اُڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

(بانگِ درا)

(۴) کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر
کیا خبر ہے تجھ کو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا

(بانگ درا)

(۵) ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سُنا چاہتا ہوں

(۶) ارنی میں بھی کہہ رہا ہوں مگر
یہ حدیث کلیم و طور نہیں

(بالِ جبرئیل)

(۷) خاموش ہے عالم معانی
کہتا نہیں حرفِ لن ترانی

(خاقانی)

(۸) تھا ارنی گو کلیمؑ، میں ارنی گو نہیں
اس کا تقاضا روا، مجھ پہ تقاضا حرام!

ولمّا جاءَ موسیٰ لمیقاتنا وَ کلمہ ربہٗ قال ربّ ارِنی اَنظر الیک قال لن ترانی
ولکن انظُر الیٰ الجبل فان استقرّ مکانہٗ فسوف ترانی فلمّا تجلّٰی ربہ للجبل
جعلہ دکًّا وّخرّ موسیٰ صَعِقًا ۵ آیت ۱۴۳ سورہ اعراف

" اور جب موسیٰ ہمارے وقت پر آئے اور ان کے رب نے ان سے باتیں کیں تو عرض کیا کہ اے مرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں، ارشاد ہوا کہ تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے لیکن تم اس پہاڑی کی طرف دیکھتے رہو پس اگر اپنی جگہ پر برقرار رہا تو تم بھی دیکھ سکو گے۔ پھر ان کے رب نے جو اس پر تجلّی فرمائی۔ تجلّی نے اس کے پرخچے اُڑا دیے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔"

کلیمؑ حضرت موسیٰ کا لقب ہے ارنی یا ربّ ارنی اکثر شعراء نے استعمال کیا ہے خواہش وصل یا طلب دید کے لیے ارنی استعمال کرتے ہیں۔ محبوب کی طرف سے جواب لن ترانی (یعنی تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے) ہوتا ہے جو انکار پر دلالت کرتا ہے۔ ان آیات کے اندر وہ سارے الفاظ موجود ہیں جن کے سلسلے میں اشعار پیش کیے گئے ہیں۔

عالم نو

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیر تقدیر
خواب میں دیکھتا ہے عالم نو کی تصویر!
اور جب بانگ اذاں کرتی ہے بیدار اسے
کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں

(عقل و دل)[1]

---

[1] بانگِ درا ص ۱۴۱

الذی احسن کل شیئٍ خلقہٗ وبدا خلق الانسان من طین ہ ثم جعل نسلہٗ من سللۃ من مّاءٍ مھین ہ ثم سوّٰہ ونفخ فیہ من روحہٖ وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلاً مّا تشکرون[۱] ہ (۳۲ : ۸ : ۶)۔

"جس نے نہایت خوب بنائی جو چیز بھی بنائی اور انسان کی بناوٹ مٹی سے شروع کی پھر اس کی نسل کو ایک بے وقت پانی کے خلاصے سے پیدا کی جسے ٹھیک ٹھاک کر کے اس میں اپنی روح پھونکی اس نے تمھارے کان آنکھیں اور دل بنائے تم بہت ہی تھوڑا احسان مانتے ہو[۲]۔" "تشکیل جدید الہیات" میں علامہ اقبال ان آیتوں کو قلم بند کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"قلب کو ایک طرح کا وجدان یا اندرونی بصیرت کہیئے جس کی پرورش مولانا روم کے دلکش الفاظ میں نور آفتاب سے ہوتی ہے اور جس کی بدولت ہم حقیقت مطلقہ کے ان پہلوؤں سے اتصال پیدا کر لیتے ہیں جو ادراک بالحواس سے ماورا ہیں۔ قرآن مجید کے نزدیک قلب کو قوت دید حاصل ہے اور اس کی اطلاعات بشرطیکہ ان کی تعبیر صحت کے ساتھ کی جائے کہیں غلط نہیں ہوتیں[۳]۔" اب مندرجہ ذیل اشعار پڑھیے۔

(۱) صبح ازل جو حُسن ہوا دلستان عِشق
آوازِ کُن ہوئی تپش آموز جان عشق

(بانگِ درا[۴] شمع)

(۲) یہ حکم تھا کہ گلشن کُن کی بہار دیکھ
ایک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ

(بانگِ درا)

۱؎ سورہ الم سجدہ، آیت ۷ تا ۹

۲؎ تفسیر ابن کثیر جلد چہارم

۳؎ تشکیل جدید الہیات ص ۲۳ اقبال ۴؎ ص ۴۵

(۳) یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون[1]

انّما امرہٗ اذا ارادَ شیئًا ان یقول لہٗ کن فیکون

(آیت ۸۲ سورہ یٰسٓ)

" وہ جب کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے اتنا فرما دینا کافی ہے کہ ہوجا وہ اسی وقت ہوجاتی ہے۔"

ما کان للّٰہ ان یتّخذ من ولدٍ سبحنہٗ اذا قضٰی امراً فانّما یقول لہٗ کن فیکون۔ (آیت ۳۵ سورہ مریم)

"اولاد خدا تعالیٰ کے لائق ہی نہیں وہ تو بالکل پاک ذات ہے وہ تو جب کسی کام کے سرانجام کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہہ دیتا ہے کہ ہوجا وہ اسی وقت ہوجاتا ہے۔"

مولانا مودودی لکھتے ہیں۔ " قدرت الٰہی کمتر درجہ کی چیزوں سے تخلیق کی ابتدار کرکے بتدریج بلند تر درجہ کی چیزیں پیدا کرتی رہی ہے۔ مثلاً جمادات پہلے پیدا کیے گئے اس کے بعد نباتات پھر حیوانات اور حیوانات میں بھی کمتر درجے کے حیوانات پہلے پیدا کیے گئے اور پھر بتدریج اعلیٰ قسم کے حیوانات پیدا کیے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ بلندترین نوع انسان کو پیدا کیا گیا۔ قدرت کا یہی قاعدہ اس عالم پر بہ حیثیت مجموعی بھی جاری ہونا چاہیے۔ یعنی موجودہ نظام عالم بہ حیثیت مجموعی ناقص ہے لہٰذا اس کے بعد ایک دوسرا نظام عالم ہونا چاہیئے جو اس سے کامل تر ہو اور اس نظام کا آنا عالم آخرت ہے گویا مرے نزدیک موجودہ نظام عالم کے بعد عالم آخرت کا آنا قدرت کے قانون ارتقار کا ایک لازمی تقاضا ہے[2]۔"

مولانا مودودی کے ارشادات تیسرے شعر کے متعلق ہیں۔ پہلے اور دوسرے شعر

---

[1] بال جبریل صفحہ ۲۸

[2] رسائل مسائل (اوّل) صفحہ ۲۸۴

ہیں لفظ کُن بمعنی تخلیق استعمال ہوئے ہیں۔

اے شمع! انتہائے فریبِ خیال دیکھ
مسجود ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ
(شمع[1])

واذ قلنا للملئکۃ اسجدوا لادم فسجدوا الاّ ابلیس (سورہ بقرہ آیت ۳۴)

"جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کے آگے جھکو تو سب جھک گئے سوائے ابلیس کے۔"

"حضرت آدمؑ سب سے پہلے انسان تھے جنھیں دنیا میں خلیفۃ اللہ بنا کر بھیجا گیا ان کا مرتبہ و مقام یہ تھا کہ خدا کے حکم سے فرشتوں نے ان کے آگے سرِ تسلیم خم کیا یعنی ان کی عظمت کا اعتراف کیا لیکن ان کی اولاد نے اس شرف انسانیت کی قدر نہ کی جو حضرت آدمؑ کی نسبت سے حاصل ہوا تھا اور خدا کی اطاعت سے بے پروا ہو کر ہوا و ہوس کی غلامی اختیار کر لی جس سے ذلت و خواری نصیب ہوئی اگر کردار کی ان خرابیوں کا جائزہ لیا جائے جو آہستہ آہستہ انسانوں میں پیدا ہوتی رہیں اور ان کی زندگی کی وہ پستی دیکھی جائے جو خدا سے دوری اختیار کرنے کا نتیجہ ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ وہی انسان ہیں جن کے باپ کی خدا نے فرشتوں سے بھی تعظیم کرائی تھی اس حقیقت کو مرزا غالب نے یوں بیان کیا تھا ۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں[2]"

گل و گلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں
یہ سبھی سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں بانگِ درا (انسان[3] اور بزمِ قدرت)

---

[1] بانگِ درا ص۴۶

[2] متاعِ اقبال ص۲۳،۲۴ [3] بانگ درا ص۴۵

سورہ والشمس مکہ میں نازل ہوئی اس کی پندرہ آیتیں ہیں۔

" سورہ والشمس آیت ۹ میں اللہ پاک نے ان آیتوں کا ذکر کیا ہے جو انسان کی ذات (نفس) کے لیے بنائی گئی ہیں پھر اس نفس میں فجور اور تقویٰ کی صلاحیت کا ذکر ہے کہ صلاحیت تو دونوں کے لیے ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انسان ان نعمتوں کو پہچان کر تقویٰ کی طرف بڑھتا ہے یا ان کو نظر انداز کر کے فجور اختیار کرتا ہے[۱] ظاہر ہے کہ گل و گلزار نعمات الٰہی ہیں اور اسی بناء پر انھیں سورۂ والشمس کی تفسیر میں کہا ہے۔"

مرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
بار جو مجھ سے نہ اٹھا وہ اٹھایا تو نے

(انسان اور بزم قدرت[۲])

انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوات والارض والجبال فابین ان یحملنھا و اشفقن منھا وحملھا الانسان ط انہ کان ظلوماً جھولاً (سورہ احزاب آیت ۷۲)

" بیشک ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں پر زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھا لیا وہ بڑا ہی ظالم جاہل ہے۔"

طلسم ظلمت شب سورۂ والنور سے توڑا
اندھیرے میں اڑایا تاج زر شمع شبستاں کا

(پیام صبح[۳])

اللہ نور السمٰوات والارض، مثل نورہٖ کمشکوٰۃ فیھا مصباح ط المصباح فی

۱؎ " اقبال اور قرآن " ص ۲۱۲ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

۲؎ بانگ درا ص ۵۵ ۳؎ بانگ درا ص ۵۶

زجاجۃ۔ الزجاجۃ کانھا کوکب دریٌّ یوقد من شجرۃ مبٰرکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ وّلا غربیۃ یکاد زیتھا یضیٓئ ولو لم تمسسہ نار نور علیٰ نور یھدی اللہ لنورہٖ من یّشاء و یضرب اللہ الامثال للناس واللہ بکلِّ شیئٍ علیم ٥ (آیت ۳۵ سورہ النور)

"اللہ تعالیٰ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا، اس کے نور کی مثال مثل ایک طاق کے ہے جس میں چراغ ہو اور چراغ شیشہ کی قندیل میں ہو اور شیشہ مثل چمکتے ہوئے روشن ستارے کے ہو وہ چراغ ایک بابرکت درخت زیتون کے تیل سے جلایا جاتا ہو جو درخت نہ مشرقی ہو نہ مغربی۔ خود وہ تیل قریب ہے کہ آپ ہی روشنی دینے لگے گو اسے مطلقاً آگ نہ لگی ہو۔ نور پر نور ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے جسے چاہے۔ لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ مثالیں اللہ تعالیٰ بیان فرمارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے حال سے بخوبی واقف ہے۔"

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تُو نے

(تصویر درد[1])

افرئیت من اتخذ الٰھہٗ ھواہُ (سورہ جاثیہ آیت ۲۳)

"کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنا خدا اپنی خواہشات کو بنالیا ہے"۔

چونکہ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے خواہشات کو خدا یعنی اپنا شریک قرار دیا ہے۔ اس طرح خواہشات گویا کہ معبود (بت) بنے ہوئے ہیں۔ انسان انھیں خواہشات کی پیروی کرتا ہے اس طرح ان کی پرستش میں اپنے حقیقی خدا کو بھول جاتا ہے۔ پس زبان تو توحید کا دعویٰ کرنے والی ہو مگر اس کے برعکس ہے۔ اس لیے نتیجہ بھی لاحاصل ہے۔

---

[1] ص۲۳، بانگِ درا

(۱) سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصہ پیمان اوّلیں میں نے
(سرگزشت آدم[۱])

(۲) مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست!
(شکست[۲])

اَلَسْتُ بِرَبِّکُم قالُوا بَلٰی شَہِدْنا (سورہ اعراف آیت ۱۷۲)

"کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں ہم سب گواہ بنتے ہیں۔"

انسان نے اس دنیا میں آنے سے پہلے عالمِ ارواح میں خدا تعالیٰ سے عہد کیا تھا یعنی خدا تعالیٰ نے ارواح سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ ارواح نے ایک زبان ہو کر جواب دیا تھا (بَلٰی) کیوں نہیں تو ہی ہمارا رب ہے لیکن دُنیا میں آکر انسان نے اس عہد کو بھلا دیا اور خواہشات نفس کی تکمیل میں ایسا منہمک ہوا گویا کوئی عہد کیا ہی نہ تھا۔ اس عہد کا مطلب تو یہ تھا کہ میں دُنیا میں خدا ہی کا ہو کر رہوں گا اور اسی کے رضا کے مطابق زندگی بسر کروں گا لیکن دنیا کے جھمیلوں اور گوناگوں ترغیبات نے اسے صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیا۔ اس عہد کو ڈاکٹر اقبالؔ نے پیمانِ اوّلین کا نام دیا ہے۔[۳]

کبھی میں ذوقِ تکلّم میں طور پر پہنچا
چھپایا نور ازل زیرِ آستیں میں نے
(بانگ درا (سرگزشت آدم[۴])

۱۔ بانگِ درا ص۸۱

۲۔ ضربِ کلیم ص۵۰

۳۔ متاعِ اقبال ص۳۶، ۲۳۷ ۴۔ ص۸۲ بانگِ درا

سورہ النساء آیت ۱۴۶

وکلم اللہ موسیٰ تکلیماً ۝ "اور باتیں کیں اللہ نے موسیٰ سے بول کر"۔ طور اور ذوق تکلم یہاں توام ہیں۔ اقبال نے اس طرف اشارہ کیا ہے یہاں تلمیح کے ذریعہ کئی آیات کی نشان دہی ممکن ہے۔ راقم الحروف نے اسی آیت پر قناعت کی کہ مقصد حل ہو جاتا ہے۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

(غزلیات[1])

رہے ہیں اور ہیں فرعون مری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ مری آستیں میں ہے یدِ بیضاء

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ آيَةً اُخْرٰى لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى۔

(آیت ۲۲، ۲۳ سورہ طٰہٰ)

"اپنا ہاتھ اپنی بغل میں ڈال لے تو وہ سفید چمکتا ہوا ہو کر نکلے گا لیکن بغیر کسی عیب اور روگ کے یہ ہے دوسرا معجزہ۔ یہ اس لیے کہ ہم تجھے اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھانا چاہتے ہیں"۔

یدِ بیضا کی ترکیب اور اشعار کا اشارہ واقعات کی طرف ہے۔

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان "رفعنا لک ذکرک" دیکھے

(جوابِ شکوہ[2])

---

[1] بانگِ درا صـ ۱۰۴ [2] بانگِ درا صـ ۱۰۷

ورفعنالك ذكرك ۔ (آیت ۴ سورہ انشراح)

" اور ہم نے (اے نبی) تیرا ذکر بلند کیا "

اس بلندئ ذکر کی شان یہ ہے کہ حضورؐ کا نام ملائکہ اور انبیاء میں بھی ممتاز ہے پھر کلمہ طیبہ، اذان، اقامت، تشہد اور خطبوں میں بار بار آپؐ کا نام لیا جاتا ہے اور آپ کے اوصاف بیان کیے جاتے ہیں اس کے علاوہ جہاں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنے احکام کی اتباع کا حکم دیا ہے وہاں اپنے نام کے بعد حضورؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کی بھی تاکید کی ہے۔

کوئی بھی ذکر و فکر حضورؐ کے نام نامی سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرمؐ کے نام سنتے ہی درود وصلوٰۃ پڑھنے کا حکم دیا ہے ارشاد ربانی ہے: ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی ط یایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما ہ

(آیت ۵۶ سورہ احزاب)

" بلاشبہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی ان پر درود بھیجو اور اچھی طرح سلام بھی بھیجتے رہا کرو "

دن رات کا کوئی لمحہ ایسا نہ ہوگا جس میں حضورؐ کا نام نامی دنیا کے کسی کونے میں نہ لیا جاتا ہو اور یہ عمل قیامت تک جاری رہے گا۔

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں[۱]

سورۂ حج آیت نمبر ۱۸ میں ارشاد ہے۔

اَلَم تر ان اللہ یسجد لہٗ من فی السموات والارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدوابُ وکثیر من الناس، (سورہ حج آیت ۱۸)

---

[۱] بانگِ درا صفحہ ۱۳۹

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے آدمی۔"

قرآن کریم کی بے شمار نصوص اور تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ عقل وشعور اور مقصد وارادہ سے کوئی بھی مخلوق خالی نہیں، کمی بیشی کا فرق ہے انسان اور جن کو اللہ تعالیٰ نے عقل وشعور کا ایک کامل درجہ عطا فرمایا ہے اور اسی لیے ان کو احکام اور اوامر و نواہی کا مکلف بنایا گیا ہے۔ ان کے سوا باقی مخلوقات میں سے ہر نوع اور ہر صنف کو اس صنف کی ضروریات کے موافق عقل وشعور دیا گیا ہے۔ انسان کے بعد سب سے زیادہ شعور وعقل حیوانات میں ہے۔ اس کے دوسرے نمبر میں نباتات ہیں، تیسرے جمادات حیوانات کا عقل وشعور تو عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ نباتات کا عقل وشعور بھی ذرا سا غور وتحقیق کرنے والا پہچان لیتا ہے لیکن جمادات کا عقل وشعور اتنا کم اور مخفی ہے کہ عام انسان اس کو نہیں پہچان سکتا مگر ان کے خالق ومالک نے خبر دی ہے کہ وہ بھی عقل و شعور اور مقصد وارادے کے مالک ہیں مثلاً قرآن کریم میں آسمان وزمین کے بارے میں ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اقرار کیا۔ قالتا اتینا طائعین یعنی ہم اپنی خوشی سے اطاعت وفرمانبرداری قبول کرتے ہیں۔[1]"

دوسری جگہ ارشاد ہے۔ الم تر ان اللہ یسبح لہ من فی السمٰوٰت والارض والطیر صٰفٰت کل قد علم صلاتہ وتسبیحہ۔ (سورہ نور آیت ۴۱)۔

(سورہ نور آیت نمبر ۴۱)

"کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے اور پرند بھی جو پر پھیلائے ہوئے ہیں سب کو اپنی اپنی دعا اور تسبیح معلوم ہے۔"

"سب کو اپنی اپنی دعا اور تسبیح معلوم ہے"۔ میں اس مضمون کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور نمازیں ساری مخلوق لگی ہوئی ہے مگر ہر ایک کی نماز اور تسبیح

---

[1] معارف القرآن جلد ششم ص ۲۴۷

کا طریقہ اور صورت مختلف ہے۔ فرشتوں کا اور طریقہ، انسان کا دوسرا اور نباتات کسی اور طرح سے عبادات، نماز و تسبیح ادا کرتے ہیں۔ جمادات کسی اور طریقے سے اور نماز پڑھنا گویا خدا سے ہمکلامی کرنا ہے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہر شئے روح رکھتی ہے اور یہی خودی ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

اسی کے بیاباں، اسی کے ببُول
اسی کے ہیں کانٹے، اسی کے ہیں پھُول

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چُور
کہیں اس کے پھندے میں جبرئیل و حور

کہیں جرّہ شاہیں سیماب رنگ
لہُو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

(ساقی نامہ)

(۱) سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

(ستارہ[1])

(۲) زمانہ کہ زنجیرِ ایّام ہے
دموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے

(ساقی نامہ)

وتلك الایّام نداولها بین الناس (آیت ۱۴۰ آل عمران)

---

[1] بانگِ درا ص ۱۴۸

" اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔"
پہلے شعر کے لیے غلام مصطفیٰ خاں نے اس آیت کا حوالہ بھی دیا ہے:
یقلب اللہ اللیل والنہار ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار۔
" اللہ بدلتا ہے رات اور دن اس میں بے شک عبرت ہے آنکھ والوں کے لیے۔" (سورہ نور آیت ۴۴)
غلام مصطفیٰ خاں نے اس آیت کے تحت اس مصرعہ کو بھی لیا ہے ع
چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

گردش تاروں کا ہے مقرّر
ہر ایک کی راہ ہے مقرّر[۱]

(سورہ اعراف آیت ۵۴)
والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ " اور سورج اور چاند اور تاروں کو بنایا سب اس کے حکم سے مسخر ہیں۔"
سورج، چاند اور ستارے اللہ کے حکم سے مسخر ہیں ہر ایک کی راہ مقرر ہے کہ جس طرف طلوع ہونے کا حکم ہے اسی طرف طلوع ہوتے ہیں اور جس طرف ڈوبنے کا حکم ہے اس طرف ڈوبتے ہیں۔ اقبال نے براہِ راست استفادہ کیا ہے۔

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا
(ترانۂ ملی[۲])

---

۱ بانگ درا ص ۱۴۸ ۲ بانگِ درا ص ۱۵۹

اِنَّ اَوَّلَ بیتٍ وُّضِعَ للنَّاسِ للّذی ببکّۃَ مُبٰرکاً وَّھُدیً لِلعَالمین ۔

(آیت ۹۶ سورہ آل عمران)

" خدا کا پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہ مکہ شریف میں ہے جو تمام دُنیا کے لیے برکت و ہدایت والا ہے "

مذکورہ آیت میں ساری دنیا کے مکانات یہاں تک کہ تمام مساجد کے مقابلہ میں بیت اللہ یعنی کعبہ کا شرف اور فضیلت بیان ہے ۔ یہ دنیا کی تمام سچی عبادت گاہوں میں سب سے پہلی عبادت گاہ ہے جس میں بُتیں بھی رکھی گئیں ۔

فرشتے بزم رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضور آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو

(حضور رسالت مآبؐ[1])

آیۂ رحمت سے مراد یہ آیت ہے :

وما ارسلنٰک الاّ رحمۃ للعالمین ٥

" اور ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے "۔

(سورہ انبیاء آیت نمبر ۱۰۷)

بُت شکن اُٹھ گئے باقی جو رہے بُت گر ہیں
تھا ابراہیم پدر، اور پسر آزر ہیں

(جواب شکوہ[2])

وَاِذْ قَالَ ابراھیم لابیہ آزر اتتخذ اصناماً الھۃ اِنّی اراک وقومک فی ضلٰلٍ مُّبین ٥ (سورہ انعام آیت ۷۵)

---

[1] بانگِ درا صـ ۱۹۷ [2] بانگ درا صـ ۱۹۹

" اور جب ابراہیمؑ نے اپنے والد آزر سے کہا کہ کیا آپ نے بتوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ میں آپ کو اور آپ کی قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔"

یہاں ترکیب سے استفادہ ہے معنی سے کوئی ربط نہیں ہے ابراہیم اور آزر دونوں کا تذکرہ قرآن حکیم سے مستعارہ ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں ملت نے تصور کو اُلٹ دیا۔ ابراہیم اپنے باپ کی بُت گری سے بیزار تھے۔ آج کے دور میں باپ بُت شکن بیٹے بُت گر ہیں۔

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعداء سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعداء سے

(جوابِ شکوہ[1])

مولانا ظفر علی خاں کا شعر ہے ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

(۱) سورہ صف آیت ۸ ص ۲۸

یُرِیدُونَ لِیُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝

ترجمہ: "(کفار) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منھ سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچانے والا ہے۔ اگرچہ کافروں کو یہ ناگوار گزرے۔"

(۲) يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ (سورہ توبہ آیت ۳۲)

(کفار) "ان کی چاہت ہے کہ نورِ خدا اپنے منھ سے بجھا دیں اور اللہ تعالیٰ اس بات پر مُصر ہے کہ وہ اپنا نور پورا کر کے رہے گا اگرچہ کہ کافرین کو ناگوار گزرے۔"

---

[1] بانگِ درا ص ۲۰۶

کفار کی ہمیشہ کوشش یہی رہی کہ نبیؐ نے نورِ ہدایت کی جو شمع روشن کی ہے اسے کسی طرح بجھا دیں یعنی اپنی شرارتوں اور مساعی کی ہلاکت آفرینیوں سے رشد و ہدایت کو پہنچنے نہ دیں لیکن جس چیز کو خدا تعالیٰ قائم و باقی رکھنا چاہتا ہے اسے مٹانے کی انسانی تدبیریں کب کامیاب ہو سکتی ہیں۔ دشمن تو شجرِ اسلام کو کبھی پھلتا پھولتا دیکھنا نہیں چاہتا لیکن جس کی آبیاری قدرت کے ہاتھوں ہو رہی ہو وہ بار آور ہو کے رہتا ہے۔ اور دشمن کی ساری آرزوئیں اور کوششیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

شبِ معراج

اخترِ شام کی آتی ہے فلک سے آواز
سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات

رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات[1]

(۲) سبق مِلا ہے یہ معراجِ مصطفٰےؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

(بالِ جبریل)

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرامِ الیٰ المسجد الاقصیٰ الذی بٰرکنا حولہٗ لنریہٗ من اٰیٰتنا انہ ھو السمیع البصیر ۝

(آیت ۱ سورہ بنی اسرائیل)

"وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو شب

---

[1] بانگِ درا ص ۲۴۹

کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے آس پاس ہم نے برکتیں کر رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم ان کو اپنے عجائبات قدرت دکھلائیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ دیکھنے والا اور سننے والا ہے"۔

قرآن مجید کے ارشادات اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے کہ اسراء اور معراج کا تمام سفر روحانی نہیں تھا بلکہ جسمانی تھا جیسے عام انسان سفر کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے پہلے ہی لفظ "سُبحٰن الّذی" میں اس طرف اشارہ موجود ہے کیوں کہ یہ لفظ تعجب اور کسی عظیم الشان امر کے لیے استعمال ہوتا ہے اگر معراج صرف روحانی بطور خواب کے ہوتی تو اس میں کون سی عجیب بات ہے خواب تو ہر مسلمان بلکہ ہر انسان دیکھ سکتا ہے۔ دوسرا اشارہ لفظ "عبد" سے اسی طرف ہے کیوں کہ عبد صرف روح نہیں بلکہ جسم و روح کے مجموعے کا نام ہے اس کے علاوہ واقعۂ معراج آنحضرتؐ نے حضرت اُم ہانی کو بتلایا تو انھوں نے حضورؐ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ اس کا کسی سے ذکر نہ کریں ورنہ لوگ اور زیادہ تکذیب کریں گے۔ اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو اس میں تکذیب کی کیا بات تھی؟"[1]

"کشتیٔ مسکیں" و "جانِ پاک" و "دیوارِ یتیم"
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
(خضرِ راہ)[2]

وَاِذْ قَالَ مُوسٰی لِفَتٰـہُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا ۝ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَیْنِھِمَا نَسِیَا حُوْتَھُمَا فَاتَّخَذَ سَبِیْلَہٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا ۝ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰـہُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا ھٰذَا نَصَبًا ۝ قَالَ اَرَءَیْتَ اِذْ اَوَیْنَآ اِلَی الصَّخْرَۃِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسٰنِیْہُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَہٗ وَاتَّخَذَ سَبِیْلَہٗ فِی الْبَحْرِ عَجَبًا ۝ قَالَ ذٰلِکَ مَا کُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓی اٰثَارِھِمَا قَصَصًا ۝ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ

---

[1] معارف القرآن جلد پنجم ص ۴۳۹ [2] بانگ درا ص ۲۵۶

عبادنا آتینہ رحمۃً من عندنا وعلمنہ من لدنا علماً ہ قال لہ موسیٰ ھل اتبعک علیٰ ان تعلمن مما علمت رشداً ہ قال انک لن تستطیع معی صبراً ہ وکیف تصبر علیٰ مالم تحط بہ خبراً ہ قال ستجدنی ان شآء اللہ صابراً و لا اعصی لک امراً ہ قال فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شیئٍ حتیٰ احدث لک منہ ذکراً ہ فانطلقا حتی اذا رکبا فی السفینۃ خرقھا قال اخرقتھا لتغرق اھلھا لقد جئت شیئاً امراً ہ قال الم اقل انک لن تستطیع معی صبراً ہ قال لا تؤ اخذنی بما نسیت ولا ترھقنی من امری عسراً ہ فانطلقا ط حتی اذا لقیا غلماً فقتلہ قال اقتلت نفساً زکیۃً م بغیر نفسٍ ط لقد جئت شیئاً نکراً ہ قال الم اقل لک انک لن تستطیع معی صبراً ہ قال ان سالتک عن شیئٍ بعدھا فلا تصحبنی ط قد بلغت من لدنی عذراً ہ فانطلقا حتی اذا اتیا اھل قریۃ استطعما اھلھا فابوا ان یضیفوھما فوجدا فیھا جداراً یرید ان ینقض فاقامہ ط قال لو شئت لتخذت علیہ اجراً قال ھذا فراق بینی وبینک سانبئک بتاویل مالم تستطع علیہ صبراً ہ اما السفینۃ فکانت لمسکین یعملون فی البحر فاردت ان اعیبھا وکان ورائھم ملک یاخذ کل سفینۃٍ غصباً ہ واما الغلم فکان ابواہ مومنین فخشینا ان یرھقھما طغیاناً و کفراً ہ فاردنا ان یبدلھما ربھما خیراً منہ زکوٰۃً و اقرب رحماً ہ واما الجدار فکان لغلمین یتیمین فی المدینۃ وکان تحتہ کنزٌ لھما وکان ابوھما صالحاً ط فاراد ربک ان یبلغا اشدھما ویستخرجا کنزھما ط رحمۃ من ربک وما فعلتہ عن امری ط ذلک تاویل مالم تسطع علیہ صبراً ہ

(سورہ کہف آیت ۶۰ تا ۸۲)

" اور وہ وقت یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں ۔ ورنہ میں ایک زمانہ دراز تک چلتا ہی رہوں گا۔ پس جب وہ ان کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر اس طرح دریا میں چلی گئی جیسے کوئی سرنگ لگی ہو۔ آگے جا کر موسیٰ

نے اپنے خادم سے کہا لاؤ ہمارا ناشتہ آج کے سفر میں ہم تو بُری طرح تھک گئے ہیں۔ خادم نے کہا آپ نے دیکھا نہیں کہ جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے اس وقت کیا ماجرا درپیش آیا مجھے مچھل کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھے ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر (آپ سے کرنا) بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی۔ موسیٰؑ نے کہا یہی ہم تو چاہتے تھے چنانچہ وہ دونوں اپنے نقش قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔

موسیٰؑ نے کہا کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے اس نے جواب دیا آپ مرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو آخر اس پر آپ صبر بھی کیسے کر سکتے ہیں۔ موسیٰؑ نے کہا انشاءاللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ اور میں کسی معاملے میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔ اس نے کہا اچھا اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں جب تک کہ میں خود اس کا آپ سے ذکر نہ کروں۔

اب وہ دونوں روانہ ہوئے یہاں تک کہ وہ کشتی میں سوار ہو گئے تو اس شخص نے کشتی میں شگاف ڈال دیا۔ موسیٰؑ نے کہا آپ نے اس میں شگاف ڈال دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں یہ تو آپ نے سخت حرکت کر ڈالی۔ اس نے کہا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔ موسیٰؑ نے کہا بھول چوک پر مجھے نہ پکڑیئے۔ میرے معاملے میں آپ ذرا سختی سے کام نہ لیں۔

پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ ان کو ایک لڑکا ملا اور اس شخص نے اسے قتل کر ڈالا۔ موسیٰؑ نے کہا آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی حالانکہ اس نے کسی کا خون نہ کیا تھا؟ یہ کام تو آپ نے بہت ہی بُرا کیا۔ اس نے کہا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم مرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے؟ موسیٰؑ نے کہا اس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں لیجیے اب تو مری طرف سے آپ کو عذر ہو گیا۔

پھر وہ آگے چلے یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے آپ نے کھانا مانگا مگر انھوں نے ان دونوں کی ضیافت سے انکار کر دیا۔ وہاں انھوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرنا چاہتی تھی اس شخص نے اس دیوار کو پھر قائم کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا کہ اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اُجرت لے سکتے تھے اس نے کہا بس مرا تمھارا ساتھ ختم ہوا اب میں تمھیں ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ اس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں کیوں کہ ایک بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ رہا وہ لڑکا تو اس کے والدین مومن تھے۔ ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کُفر سے ان کو تنگ کرے گا اس لیے ہم نے چاہا کہ ان کا اب اس کے بدلے ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلہ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لیے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا اس لیے تمھارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تمھارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے۔ میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا ہے یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے"۔

جناب موسیٰؑ کے اس واقعہ میں مفسرین کے درمیان بے شمار اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک اختلاف یہ ہے کہ موسیٰؑ سے مراد کون سے موسیٰ ہیں بعض یہودیوں کا خیال ہے کہ یہ موسیٰ بن میشا بن یوسف بن یعقوب تھے جن کا زمانہ جناب موسیٰؑ سے پہلے تھا اور اکثر مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہ جناب موسیٰؑ بن عمران ہی تھے۔

دوسرا اختلاف اس جوان کے بارے میں ہے جو جناب موسیٰؑ کے ساتھ تھا وہ کون تھا اکثر حضرات نے کہا ہے کہ وہ جناب یوشع بن نون تھے جو جناب موسیٰؑ کے بھانجے تھے اور بعد میں ان کے وصی بھی قرار پائے تھے۔

تیسرا اختلاف اس بندۂ خدا کے بارے میں ہے جس سے ملاقات کے لیے گئے تھے۔

بعض کہتے ہیں کہ ان کا نام خضرؑ تھا اور بعض کا خیال ہے کہ ان کا نام فیلیا بن ملقان تھا اور خضر ان کا لقب تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں خدا نے طویل حیات عطا کی تھی۔ بعض مفسّرین نے ان کو ملائکہ میں شمار کیا ہے۔

چوتھا اختلاف اس واقعہ کے سبب کے بارے میں ہے اور مشہور یہ ہے کہ کسی نے جناب موسیٰؑ سے پوچھا تھا کہ اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے؟ تو انھوں نے فرمایا تھا کہ میں ـــــ تو حکم خدا ہوا کہ مجمع البحرین پر جاکر مرے ایک بندہ سے ملاقات کرو کہ وہ تم سے بڑا عالم ہے اور خبردار کوئی شخص اپنے بارے میں ایسی بلندی کا تصوّر نہ کرے (واللہ اعلم)

اقبالؔ نے بجنسہٖ "جان پاک" نفس زکیہ، کا ترجمہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں یہ لفظ جناب موسیٰؑ نے استعمال کیا ہے اور انھوں نے یہ لفظ لاعلمی کی بناء پر استعمال کیا ہے۔ اقبالؔ "جان پاک" کی ترکیب کی بجائے اگر کوئی دوسری ترکیب رکھتے تو وہ زیادہ بہتر تھا کیوں کہ وہ شخص بڑا ہوکر اپنے کفر اور سرکشی کی بناء مومن اور نیک والدین پر سختیاں کرنے والا تھا۔

اپنی جگہ یہ مہتم بالشان واقعہ مفسّرین کے لیے موضوعِ بحث رہا ہے اس کے بہت سارے گوشے ایسے ہیں جو عام طور پر سمجھ میں نہیں آتے۔ مثلاً اس حسین نوجوان کا قتل جس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ بڑا ہوکر سرکشی اور کفر کی بناء پر اپنے والدین کو تنگ کرنے والا تھا۔ شرعی اصول یہ ہے کہ جب تک ارتکاب گناہ نہ ہو اس وقت تک کسی کو مجرم اور گنہگار تو بڑی بات ہے ملزم بھی نہیں قرار دیا جاسکتا پھر اس کا قتل کس طرح جائز تھا۔

یہ اور اس قبیل کے دیگر اعتراضات ہوسکتے ہیں لیکن اس کا شرعی جواب دینا مفسّرین کرام اور علمائے اعلام کا کام ہے۔ ایک طالب علم اس پر رائے زنی نہیں کرسکتا۔ البتّہ اقبالؔ کے کلام سے استفادہ کرتے ہوئے کچھ پہلو سامنے آتے ہیں۔

اقبالؔ کی شاعری کا پورا محور کشمکش سے عبارت ہے کہیں یہ اثبات و نفی کے درمیان ہے کہیں موضوع اور معروض کے درمیان ہے۔ کہیں اس کا نام خیر و شر ہے کہیں

یہ موت اور زندگی ہے اور کہیں یہ عقل و عشق، کہیں ذکر و فکر اور کہیں علم و عشق ہے۔

"ہمارا موضوع آخر کی یہ تین کشمکش یعنی عقل، فکر، اور علم ہے اور یہ ایک ہی فکری تسلسل سے مربوط ہیں۔ علم یا فکر یا عقل میں معروضیت، استدلال، محسوسات اور مدرکات شامل ہیں۔ اس کو تخمین، ظن، گمان، قیاس، استقرار وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوسرا سلسلہ عشق کا ہے جس میں کائنات کے لفظوں میں فوق تجربی علم یا عقل خالص یا وجدان کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اقبالؔ نے اس علم کو عشق سے بھی تعبیر کیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس علم کو علم لدنی کہا گیا ہے۔ آیتِ شریفہ میں کہا گیا ہے کہ جسے ہم نے علم لدنی عطا کیا تھا[۱] یہ وہ علم ہے جو مستقبل کے کچھ گوشوں پر سے نقاب اٹھا لیتا ہے اور اسے حال میں لے آتا ہے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ان بزرگ کا نام خضرؑ تھا۔ اقبالؔ نے اس واقعہ کے ذریعے سے خضرؑ کو علم لدنی کا حامل قرار دیتے ہوئے ان علوم سے گریز کیا ہے جہاں ظواہر کی اہمیت ہے اور استدلال، بحث، جرح، اسباب و علل کے قوانین سے الگ ہٹ کر بدیہیات وجدان اور غیب کے علم پر تکیہ کیا ہے۔ اس طرح اقبالؔ کے کلام کا پورا فلسفہ اس واقعہ کے پس منظر میں عقل و عشق کی کشمکش یا علم و عشق کی کشمکش جناب موسیٰؑ اور جناب خضرؑ کے واقعے سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت دلچسپ پہلو ہے کہ اقبالؔ کی شاعری میں جناب موسیٰؑ یا کلیمؑ یا ضربِ کلیم یا عصا یا شبان یا کلیمی وغیرہ کی تراکیب بے شمار ہیں اور تمام انبیاء کے احترام کے ساتھ ساتھ اقبالؔ اپنے شعری منظر نامے کی تشکیل میں جناب موسیٰؑ سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔"[۲] لیکن اس ایک شعر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اقبالؔ حضرت موسیٰؑ کی بجائے حضرت خضرؑ کو اپنا محورِ فکر بناتے ہیں۔

(۱) وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل (جوابِ خضرؑ)[۳]

---

[۱] وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝ آیت ۶۵ سورہ کہف۔

[۲] استفادہ استادِ محترم [۳] بانگِ درا ص ۲۵۸

(۲) ترے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور
ترا منار بلند جلوہ گہ جبرئیل

(مسجد قرطبہ)

ذُو مِرَّۃٍ فَاسْتَوٰی ۝ وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ۝

(آیت نمبر ۶، ۷، سورہ نجم)

"جو زور آور ہے وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور وہ بلند آسمان کے کناروں پر تھا۔"
اس سورہ میں حضرت جبرئیل امین کا تذکرہ ہے اور اس تذکرہ کو اس حدیث سے ملا کر دیکھنا چاہیے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ انھوں نے حضرت جبرئیل امین کو افق کے بلند ترین حصّے پر دیکھا تھا۔ اقبالؔ نے اس بلند ترین اُفق کو مسجد کے مینارِ بلند سے استعارہ کر کے نئی معنویت بخشی ہے۔ اس لیے کہ دنیاوی اعتبار سے ہر بلندی اضافی حیثیت رکھ کر پستی میں بدل سکتی ہے لیکن مسجد کا مینارِ بلند اللہ سے نسبت کی بنا پر ہمیشہ بلند رہے گا۔ اسی لیے اسے جلوہ گہ جبرئیل کہا گیا۔ خضر راہ والے مصرعے میں "بام گردوں سے جبینِ جبرئیل" کا تذکرہ ہے اور مرد کا سارا حسن و جمال اس کے روشن جبین اور تابناک ہونے میں ہے چوں کہ قرآن حکیم میں جبرئیل کے صاحبِ حُسن و جمال کا ذکر کیا گیا ہے اسی لیے اقبالؔ نے "جبین جبرئیل" کی ترکیب وضع کی ہے۔

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ

(جواب خضرؑ)[1]

(آیت ۷۶، ۷۷، ۷۸۔ سورہ انعام)

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْہِ الَّیْلُ رَاٰ کَوْکَبًا قَالَ ھٰذَا رَبِّیْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ ھٰذَا رَبِّیْ ۔ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ یَھْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَکُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ

---

[1] بانگ درا ص ۲۵۸

الضالین ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَۃً قَالَ ھٰذَا رَبِّیْ ھٰذَا اَکْبَرُ فَلَمَّا اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ۝

" پھر جب اندھیرا کردیا اس پر رات نے اس (ابراہیمؑ) نے ایک ستارہ دیکھا کہنے لگا یہ ہے مرا رب اور جب وہ غائب ہوگیا تو کہنے لگا میں غائب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا پھر جب چمکدار چاند دیکھا کہنے لگا یہ ہے میرا رب۔ وہ بھی غائب ہوگیا تو کہنے لگا اگر نہ ہدایت کرے مجھ کو میرا رب تو یقیناً میں گمراہ لوگوں میں سے ہوؤں گا۔ پھر جب سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا، کہا یہ ہے میرا رب، یہ بڑا ہے لیکن جب وہ بھی غروب ہوگیا تو کہنے لگا اے قوم! میں تمھارے مشرکانہ عقائد و اعمال سے بیزار ہوں۔"

یہ حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا ایک واقعہ ہے آپ نے خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق وقت کے مروجہ عقائد کی اس طرح تردید کی کہ رات کو آسمان پر ستارہ دیکھکر کہا کہ یہ ہے میرا رب (اس وقت کے لوگ کواکب کی بھی پرستش کیا کرتے تھے) ستاروں سے بڑا چاند دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب، صبح کو سورج طلوع ہوا اس کی آب و تاب اور جلوہ افشانی کو دیکھ کر کہا یہ ہے میرا رب کیوں کہ یہ تاروں اور چاند سے بھی بڑا ہے لیکن جب سکوتِ شام میں وہ بھی غروب ہوگیا تو آپ پکار اُٹھے ان سب میں کوئی بھی خُدا نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ یہ ایک وقت تک چمک دمک دکھا کر غائب ہوجاتے ہیں ایسے غائب ہوجانے والوں کو میں پسند نہیں کرتا اور نہ انھیں خدا سمجھتا ہوں۔ مِٹ جانا اور غائب ہوجانا خدا کی صفت نہیں ہوسکتی۔"

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الملوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

(سلطنت جوابِ خضر)[1]

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً

---

[1] بانگِ درا صد ۲۶۰

وکذٰلِکَ یفعلون ٥ (آیت ۳۴ سورہ نمل)

"اس نے کہا (بلقیس) کہ بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اسے اُجاڑ دیتے ہیں اور وہاں کی ذی عزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ فی الواقع وہ اسی طرح آتے تھے۔"

حضرت سلیمانؑ نے ملکۂ سبا کو ہُدہُد (پرندہ) کے ذریعے ایک خط بھجوایا جس میں دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت تھی انھوں نے اس خط کو بسم اللہ الرحمٰنِ الرحیم سے شروع کیا تھا۔ یہ خط مختصر اور جامع تھا۔ خط کو ہُدہُد ملکہ کے سامنے رکھ کر ادب کے ساتھ دوسری طرف کھڑا ہو گیا ملکہ حیرت زدہ ہوئی، اس نے اپنے مشیروں کو جمع کیا اور ان سے مشورہ طلب کیا سب نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ ہماری طاقت مسلّم ہے آگے جو آپ کا حکم ہو ہم اس کی تابع داری کریں گے، بلقیس چونکہ عاقبت اندیش اور سمجھدار تھی ہدہُد کے ہاتھوں خط کے ملنے کا کھلا معجزہ دیکھ چکی تھی اس لیے اس نے اپنے وزیروں اور مشیروں سے کہا۔ بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی ملک کو فتح کرتے ہیں تو برباد کر دیتے ہیں۔ وہاں کے معزز لوگوں کو ذلیل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قول کی تصدیق کی۔ چنانچہ آج تک عموماً فاتح لوگوں نے مفتوحوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا۔

البتہ حضورؐ اور آپؐ کے جاں نثار صحابہ کا یہ شیوہ رہا کہ دشمنوں کو عام معافی کا حکم فرمایا اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا بلکہ بعض کو اعلیٰ مرتبے عطا کیے۔

(۱) خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسم سامری

جواب خضر[1] (سلطنت)

(۲) میں ہوں نومید تیرے ساقیان سامری فن سے
کہ بزم خاروان میں لے کے آئے سانگیں خالی!

(ضربِ کلیم[2])

---

[1] بانگِ درا ص ۲۶۱ [2] ضربِ کلیم ص ۵۳۳

(آیت ۹۵ سورہ طٰہٰ)

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ۔

موسیٰؑ نے پوچھا اے سامری ترا کیا حال ہے؟

(آیت ۸۵ سورہ طٰہٰ)

قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ۔

"فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) ہم نے تری قوم کو ترے پیچھے آزمائش میں ڈال دیا اور انھیں سامری نے بہکا دیا۔"

فرعون نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا حضرت موسیٰؑ نے انھیں آزاد کرایا ان سب کو لے کر رات کے وقت شہر سے نکل گئے۔ فرعون نے جب صبح کو دیکھا کہ سب لوگ چلے گئے تو تعاقب میں فوج بھیجی جب فوج قریب آگئی اور سامنے سمندر حائل ہوگیا تو حضرت موسیٰؑ نے دریائے نیل پر عصا مارا۔ عصا کے مارتے ہی بارہ راستے بن گئے اس طرح موسیٰؑ اور تمام بنی اسرائیل ان راستوں سے گذر گئے۔ فرعونی افواج جو تعاقب میں تھی غرقاب ہوگئی۔ بنی اسرائیل کے ساتھ ایک شخص سامری بھی تھا جو جادو ٹونے سے واقف تھا۔

راستے میں بنی اسرائیل نے بُت دیکھی تو بُت پرستش کی اجازت چاہی حضرت موسیٰؑ نے انھیں ڈرایا دھمکایا آگے بڑھے ایک مقام پر ان سب کو ٹھہرایا اور خود اپنے رب سے ملنے کوہِ طور پہنچے۔ حضرت موسیٰؑ کو روزہ رکھنے کا حکم ہوا اور آپؑ وہاں تیس ۳۰ دن کی بجائے چالیس ۴۰ دن ٹھہر گئے۔ ادھر حضرت ہارونؑ نے تمام لوگوں کو حکم دیا کہ فرعون کے لوگوں کی بہت سی چیزیں (زیورات وغیرہ) جو تمھارے پاس ہیں (عاریۃً یا امانۃً) ان سب کو ایک جگہ جمع کرکے دفن کردو یہ تمھارے لیے حلال نہیں۔ سامری حضرت جبرئیل کے قدم مبارک کے نیچے کی ایک مٹھی مٹی ساتھ رکھتا تھا اسے اس نے ان زیورات میں ڈال دیا۔ ڈالتے ہی وہ عجیب و غریب بچھڑا بن گیا۔ یہ عجیب و غریب واقعہ دیکھ کر بنی اسرائیل کئی فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک فرقے نے اس کو خدا مان لیا۔ ادھر چالیس روز پورے کرنے کے بعد موسیٰؑ کو شرفِ کلام حاصل ہوا

تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس فتنے کی خبر دی۔ موسیٰؑ وہاں سے بڑی غصّے اور افسوس میں اپنے قوم کے پاس آئے اور اس بچھڑے کی طلسم کو ختم کر کے جلا دیا اور اسے دریا میں بہا دیا۔

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیراں دستاں سخت ہیں فطرت کی تقریریں

(طلوعِ اسلام[1])

(سورہ شعراء آیت نمبر ۱۳۰)

واذا بطشتم بطشتم جبّارین ۝

اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو سختی اور ظلم سے پکڑتے ہو"۔

اِنَّ اللّٰہ شدید العقاب ۝

" اللہ تعالیٰ بھی سخت عذاب کرنے والا ہے[2]"۔

اقبالؔ نے "چیراں دستاں" کی ترکیب "بطشتم بطشتم جبّارین" سے اخذ کی ہے "۔ قدرت کی تقدیریں سخت ہیں" واللہ شدید العقاب سے متاثر ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

بانگِ درا (غزلیات[3])

قالوا حرّقوہ وانصروا الھتکم ان کنتم فعلین ۝
قلنا یا نارُ کونی برداً وسلما علیٰ ابراھیم ۝

(آیت ۶۸، ۶۹ سورہ انبیاء)

---

[1] بانگِ درا صـ ۲۷۱

[2] سورہ حشر آیت نمبر ۴۔ قرآن میں کئی مقام پر ہے۔ [3] صـ ۲۷۸

"کہنے لگے (نمرود و کفار و مشرکین) کہ اسے (ابراہیمؑ) کو جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو اگر تمھیں کچھ کرنا ہے۔ ہم نے کہا کہ اے آگ تو ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا"۔

حضرت ابراہیمؑ ہر امتحان میں ثابت قدم رہے خود اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ ہم نے حضرت ابراہیمؑ کا کئی باتوں میں امتحان لیا اور انھوں نے اسے پورا کیا۔ سخت سے سخت آزمائش میں بھی آپ کامیاب ہوئے۔ بے آب و گیاہ ریگستان میں بیوی اور شیر خوار بچے کو چھوڑنے کا حکم ہوا آپ نے اس حکم کی تابع داری کی۔ کمسن بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو خواب میں قربانی کرنے کا حکم ہوا آپ نے اس حکم کے بجا لانے میں بھی ذرا ہچکچاہٹ نہ کی۔ بادشاہ نمرود نے آگ کے شعلوں میں پھینکنے کا حکم دیا۔ آپ اپنے ارادے میں مضبوط اور ثابت قدم رہے۔ حضرت ابراہیمؑ عشق کی مستی میں سرشار تھے۔ بھلا آپ کب ڈرنے والے تھے۔ آخر آگ کو ہی ٹھنڈا ہونا پڑا۔ نمرود کو منھ کی کھانی پڑی۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ کامل جذبۂ عشق تھا جس کی وجہ سے انھوں نے یہ جرأت مندانہ قدم اُٹھایا اور عقل جو محوِ حیرت تھی کس طرح آگ میں کودنا پسند کر سکتی تھی؟ عقل کی مصلحت پسندی کو پیچھے ڈھکیل کر عشق بے خطر آگ میں کود پڑا ؎

آج بھی ہو جو ابراہیمؑ سا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اسی خیال کو دوسرے انداز سے حالاتِ حاضرہ پر منطبق کیا ہے ؎

آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ[1]

---

[1] بانگِ درا ص ۲۸۲

سورہ نور آیت ۵۱ میں ہے۔

اِنّمَا کانَ قولَ المومنین اذا دُعوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا و اطعنا۔

" ایمان والوں کا کام صرف یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ رسول ان کے درمیان حکم کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سُن لیا اور اطاعت کی۔" دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَا کانَ لمومنٍ وّلا مُومنۃٍ اذا قضی اللہ و رسولہٗ امرًا ان یکون لھم الخیرۃ مِنُ امرھم۔ (سورہ احزاب آیت نمبر ۳۶)

" کسی مسلمان مرد اور عورت کو خدا اور اس کے رسول کے بعد اپنے کسی امر کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔"

خدا اور اس کے رسول کے حکم کے بعد کسی کو چوں چرا کہنے کی اجازت نہیں اور عشق یہی فریضہ انجام دیتا ہے۔ اقبالؔ اس عقیدے کا براہِ راست نصیحت کرتے ہیں۔

اے مُسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر
آیۂ لا یخلِفُ المیعاد رکھ

بانگِ درا (غزلیات[۱])

مُسلم استی سینہ را آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یخلِفُ المیعاد دار

بانگِ درا (جوابِ خضرؑ)

سورہ آل عمران آیت ۹

ربنا انک جامع النّاس لیومٍ لاّ ریب فیہ ط انّ اللہ لا یخلِفُ المیعاد۔

---

[۱] بانگِ درا ص۲۸۲

"اے ہمارے پروردگار بلاشبہ آپ تمام آدمیوں کو (میدانِ حشر میں) جمع کرنے والے ہیں۔ اس دن میں جس (کے آنے) میں ذرا شک نہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔"

سورہ رعد آیت نمبر ۳۱

ولا یزال الذین کفروا تصیبھم بما صنعوا قارعۃ او تحل قریبا من دارھم حتی یاتی وعد اللہ ط ان اللہ لا یخلف المیعاد ہ

"کفار کو تو ان کے کفر کے بدلے ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی سخت سزا پہنچتی رہے گی یا ان کے مکانوں کے ارد گرد گھومتی رہے گی تا وقتیکہ وعدۂ خداوندی آپہنچے۔ بے شک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا[1]۔"

یہ لسان العصر کا پیغام ہے
انّ وعد اللہ حقٌ یاد رکھ

بانگِ درا

سورہ لقمٰن آیت ۳۳

انّ وعد اللہ حق فلا تغرنکم الحیوۃ الدنیا ....

"بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے پس تم کو دنیا کی زندگی بہکا نہ دے۔" یہ بھی صنعت تلمیح کی بہت اچھی مثال ہے۔ دوسرے مصرعے میں ایک رُکن سے آیۃ شریفہ کے پورے مفہوم کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز
ٹل نہیں سکتا "وقد کنتم بہ تستعجلون"

(ظریفانہ[2])

---

[1] یہاں بھی صنعت ملمع ہے اور آیت کا ربط بالکل واضح ہے۔ [2] بانگِ درا ص ۲۸۹

سورہ یونس آیت ۵۱

اثمّ اذا ما وقعَ آمنتم بہ آلئٰن وقَدْ کنتم بہ تَستَعجِلون ۝

"کیا پھر جب وہ آہی پڑے گا اس کی تصدیق کروگے ہاں اب مانا حالاں کہ تم اس کی جلدی مچایا کرتے تھے۔"

ذوقوا فتنتکم ھذالذی کُنتم بہ تستَعجلون۔

"اپنی سزا کا مزا چکھ یہی ہے جس کی تم جلدی مچارہے تھے۔"

کافرین کو چوں کہ قیامت کا یقین نہیں ہے اس لیے رسول سے ازراہِ طنز بار بار پوچھتے ہیں کہ قیامت کب قائم ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں بیان فرمارہا ہے کہ اب تمھیں جلدی پڑی ہے لیکن جب وہ گھڑی آجائے گی تو ہرگز نہ ٹلے گی۔

کھُل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشم مُسلم دیکھ لے تفسیر حرف "ینسلون"

(بانگِ درا ظریفانہ[1])

آیت ۹۶ سورہ انبیاء

حتّیٰ اذا فُتِحت یاجوج ماجوج وھُم مِن کُلِّ حدبٍ ینسلُون۔

"یہاں تک کہ جب کھول دیے جائیں یاجوج و ماجوج اور ہر بلندی (ٹیلہ اور پہاڑ) پر اترے ہوئے (معلوم) ہوں گے۔"

'حدب'، اونچی جگہ چاہے وہ پہاڑ ہوں یا ٹیلے کو کہتے ہیں۔ سورہ کہف میں یاجوج ماجوج کے محل وقوع کو دنیا کے شمالی پہاڑوں کے پیچھے بتایا گیا ہے۔ اس لیے خروج کے وقت اسی طرف سے پہاڑوں یا ٹیلوں سے اُمنڈتے ہوئے نظر آئیں گے۔

"ینسلون" کا مصدر نسلان ہے اور اس کے معنی تیز چلنے کے ہیں۔

---

[1] بانگ درا صد ۲۸۹

صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ رضؓ سے روایت ہے کہ ہم چند صحابہ ایک روز آپس میں کچھ مذاکرہ کر رہے تھے رسول اللہ صلعم تشریف لائے دریافت فرمایا کہ کیا مذاکرہ تمھارے درمیان جاری ہے۔ ہم نے عرض کیا قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک دس علامتیں اس سے پہلے ظاہر نہ ہو جائیں ان دس علامتوں میں خروج یاجوج و ماجوج کا بھی ذکر فرمایا۔

قرآن مجید میں لفظ "ینسلون" اور دوسری جگہوں پر بھی ہے۔ مثلاً سورۂ یٰسٓ آیت ۵۱۔

ونفخ فی الصور فاذا ھم من الاجداث الیٰ ربھم ینسلون۔

"اور صور پھونکے جاتے ہی سب کے سب اپنی قبروں سے اپنے پروردگار کی طرف تیز تیز چلنے لگیں گے۔

فضلِ الٰہی عارف نے یہ لکھا ہے۔

"بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یاجوج و ماجوج دو مفسد قومیں ہیں جو قیامت کے قریب ایک دیوار کے پیچھے سے جسے وہ کھودنے میں مصروف ہیں نکلیں گی اور بعضوں کی تحقیق کے مطابق یاجوج و ماجوج سے مراد شمال مشرقی میدانوں کے وحشی طاقتور قبائل ہیں جن کے حملے کی روک تھام کے لیے چینیوں کو سینکڑوں میل لمبی دیوار بنانی پڑی۔ یہ قبائل ایشیا میں تاتاریوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ بہرحال ان کے ذکر سے اقبالؔ کا مقصد یہ ہے کہ سرمایہ داری کا فتنہ بھی یاج و ماجوج کے خروج کی طرح ہے جسے روکنا دشوار ہوگا۔ اس فتنے کو کوئی کتنا ہی حکمت و تدبیر سے ٹالنا چاہے ٹل نہیں سکتا اور چاہے کوئی کیسا ہی مضطرب ہو اس کا تسلط آسانی سے دور نہیں کیا جا سکتا۔"[1]

حکم حق ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار[2]

(۱ بانگ درا ظریفانہ)

---

[1] متاعِ اقبال۔ فضل الٰہی عارف [2] بانگ درا ص ۲۹۱

سورہ نجم آیت نمبر ۳۹۔

وَان لیسَ للا نسَانِ اِلاّ مَاسعیٰ۔

ترجمہ: "اور آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا۔"

یہاں آیت شریفہ سے استفادہ ہے۔ جب مزدور کی کمائی ہے تو اسی کو ملنا چاہیئے سرمایہ دار کو نہیں۔ اس لیے کہ اس نے سعی نہیں کی۔

ابتداء میں شرح رمز آیۃ لاتقربا
کس قدر مشکل تھا پہلا امتحاں اہل درد

بانگ درا (غیر مطبوعہ کلام)[1]

سورہ بقرہ آیت ۳۵

ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا مِن الظّٰلِمِین۔

"تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم ظالمین میں سے ہو جاؤ گے۔"

یہاں صنعت ملمع بھی ہے۔ اقبالؔ نے انسانی ارادہ و اختیار پر پابندی لگانے کو امتحان اہل درد سے تعبیر کیا ہے۔

قلزم ہستی سے تو اُبھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں ترا امتحاں ہے زندگی

(خضر راہ)[2]

اس شعر میں انسان کو پانی کے ایک بُلبُلے سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس دُنیا کو ایک "زیاں خانہ" بتایا گیا ہے۔ اور پھر زندگی انسان کے لیے امتحان کی مانند ہے یعنی دنیا ایک ایسی جگہ ہے جہاں پل بھر کی غفلت "زیاں" کا باعث بن سکتی ہے۔ اس شعر پر ذرا غور کریں تو یہ سورہ "العصر" کی طرف اشارہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

والعصرہ اِنّ الانسان لفی خسرہ اِلاّ الذین آمنوا وعملوا الصّٰلِحاتِ وتواصوا بالحق ط وتواصوا بالصبرہ " قسم ہے زمانے کی یقیناً انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں

---

[1] کلیاتِ اقبال کمرشیل بک ڈپو چار مینار ص ۲۴۵ [2] بانگ درا ص ۲۹۳

کے جو ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کریں اور ایک دوسرے کو نصیحت کریں حق گوئی کی اور ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں صبر کی لئے[۱]"

خسارہ کے معنی نقصان یا "زیاں" کے ہیں اور جس جگہ انسان کو ہر گھڑی زیاں کا خطرہ ہو اسے زیاں خانہ کہنا عین بلاغت ہے اور پھر زندگی کو امتحان قرار دینا عین قرآنی اصطلاح ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ وَلَنَبلُوَنَّکُم بِشَیءٍ مِن الخوف والجوعِ ونقصٍ من الاموال والانفس والثمرات[۲] "ہم کسی نہ کسی طرح تمھاری آزمائش کریں گے دشمن کے ڈر سے، بھوک پیاس سے، مال و جان اور پھلوں کی کمی سے۔"

مری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
(بالِ جبریل[۳])

اللہ کو اللہ ہی کی خاطر چاہنے والا جب اس کے حریم میں پہنچتا ہے تو ایک شور اُٹھا ہے کہ کیا ایسا بھی کوئی چاہنے والا ہے جو صفات کی وجہ سے نہیں بلکہ ذات کی وجہ سے مجھے چاہتا ہے اور عالم صفات میں بھی ایک ہلچل مچ جاتی ہے کہ صفات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یہ چاہنے والا سیدھا حریم ذات میں پہنچ رہا ہے یہ ایک خاص الخاص موحد کی شان ہے۔

سورہ کہف آیت ۳۸ میں ارشاد ہے۔

ھو اللہ ربّی ولا اُشرِکُ بربّی احداً " وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہیں ٹھہراتا۔"

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں (بالِ جبریل[۴])

لہ سورہ عصر پ ۳۰   ۲ہ سورہ بقرہ آیت ۱۵۵۔

۳ہ بالِ جبریل ص ۲۹۷   ۴ہ بالِ جبریل ص ۲۹۷

انسان جیسے ضعیف البیان کو خلیفۃ اللہ کا منصب عطا فرمایا جانا ہی اللہ پاک کا سب سے عظیم راز ہے جو فاش کیا گیا۔

سورہ بقرہ آیت ۳۰ میں ہے وَ اِذ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

"اور جب تمھارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، بولے کیا ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تری تسبیح اور تری پاکی بیان کرتے ہیں۔ فرمایا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔" اقبالؔ کا ایک اور شعر ہے:

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب! لامکاں ترا ہے یا مرا

لامکاں میں عشق نہیں، فرشتے ضرور عبادت کرتے ہیں لیکن دردِ دل انسان کو بخشا گیا ہے چنانچہ "ہنگامہ ہائے شوق" کے لیے انسان اس دنیا میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے[1]

اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر؟
مجھے معلوم کیا! وہ رازداں ترا ہے یا مرا؟
(بالِ جبریل[2])

سورہ بقرہ آیت ۳۴ میں ہے:

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَ اسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝

"اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا" سوائے

---

[1] اقبال اور قرآن ص ۵۴۵ [2] بالِ جبریل ص ۲۹۸

ابلیس کے کہ منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہو گیا۔"

ابلیس کا غرور اور اس کا انکار بھی اللہ تعالیٰ کا راز معلوم ہوتا ہے۔

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر
(بالِ جبریل)

جب کامل ایمان کی دولت حاصل ہو جاتی ہے تو نانِ شعیر کھانے کے باوجود درِ خیبر کو اکھاڑ دینے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین ولکن المنفقین لایعلمون

" اور زور اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا اور ایمان والوں کا لیکن منافقین نہیں سمجھتے"

غلام مصطفیٰ خاں نے اس آیت میں "زور ایمان والوں کا" سے بازوئے حیدرؓ پر استدلال کیا ہے۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
(بالِ جبریل)[1]

سورہ بقرہ آیت ۳۶

وَقلنا اھبطو بعضکم لبعض عدوٌ ولکم فی الارض مستقرٌ ومتاعٌ الیٰ حین ہ

" اور ہم نے کہا یہاں سے نکل جاؤ تم میں سے ہر ایک دوسرے کا دشمن ہے اب تمھیں زمین میں رہنا ہے اور ایک "معینہ مدت" تک فائدہ اٹھانا ہے۔"

"ممنوعہ پھل کھانے کی بنا پر حضرت آدمؑ کو جنت سے نکال دیا گیا اور معینہ مدت تک دنیا سے فائدہ اٹھانے کے لیے کہا گیا اور یہ معینہ مدت دراصل کافی وسیع ہے[2]۔"

---

[1] بال جبریل ص ۲۹۹ [2] فضل الٰہی عارف۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں انسان کی زندگی گرچہ کہ بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ مگر دنیا میں آکر انسان اس قدر مصروف ہو جاتا ہے کہ گویا اب اس کو مرنا ہی نہیں ہے۔ انسان کا اگر بس چلے تو وہ قبر سے بھی نکل کر ایک آدھ کام کرے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے دنیا کی زندگی کی مصروفیت کو " کار جہاں دراز ہے" کہا ہے۔

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

(بالِ جبرئیل[1])

حضرت آدمؑ جنت سے نکالے گئے ایک معینہ مدت تک کے لیے آپ زمین پر بھیج دیے گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی زمین کو آباد کر دیا۔ اور یہ کام دراصل آدمؑ کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ فرشتے اس کام کے اہل نہ تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے کہا " انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ۔" اقبالؔ نے حضرت آدمؑ کو قصوروار، غریب الدیار اور دنیا کو آباد کرنے والا کہا ہے یہاں براہِ راست کسی آیت سے استفادہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ علامہ نے حضرت آدمؑ کے قرآنی واقعہ سے استفادہ کیا ہے۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

(بالِ جبرئیل[2])

قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ۝

سورہ الصّافات آیت نمبر ۱۰۲۔

" کہا (اسماعیل نے) ابا جان آپ کو جس بات کا حکم ہوا ہے اسے کر گزریے مجھے آپ انشاء اللہ صابروں میں سے پائیں گے۔"

---

[1] بالِ جبرئیل صـ ۲۰۰ [2] بالِ جبرئیل صـ ۳۰۶

حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کئی مرتبہ ہوئی اور آپ ہر آزمائش میں کامیاب ہوئے خصوصاً بیوی اور شیر خوار بچے حضرت اسمٰعیلؑ کو بے آب وگیاہ میدان میں چھوڑنے کا حکم ہوا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسماعیل کے حق میں دعا کی آپ کی تمام دعائیں قبول ہوئیں۔ آپ کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی تھی۔ ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک

آیت ۱۲۸ سورہ بقرہ۔

" اے ہمارے پروردگار (ہم دونوں یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ) ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع فرمانبردار بنا لیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت ایسی پیدا کیجئے جو آپ کی فرمانبردار ہو"۔ یہی دراصل فیضان نظر تھا کہ اس وقت جب حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں یہ حکم ہوا کہ اپنے بیٹے کی قربانی دو تو آپ ذرا بھی تذبذب میں نہ پڑے اور نہ ہی بیٹے نے کچھ کہا۔ بیٹا یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ ابا حضور یہ تو خواب کی بات ہے خواب کی بات کیا سچ ہو سکتی ہے، وغیرہ مگر یہاں تو حضرت اسماعیلؑ آدابِ فرزندی سے پوری طرح واقف تھے۔

مرے خاک وخوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب وتاب جاودانہ!

(بالِ جبریل)[1]

" اقبال اور قرآن" میں غلام مصطفےٰ نے لکھا ہے:

" یہ دنیا مسلمان کے جہاد اور شہادت کی وجہ سے آباد ہے"۔ سورہ حج آیت ۷۸، میں ہے۔

وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ ھو اجتبٰکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ہ

" اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ حق ہے جہاد کرنے کا۔ اس نے تمھیں پسند کیا اور تم پر دین میں کچھ تنگی نہ رکھی"۔ اور شہید کو " تب وتاب جاودانہ" یعنی ابدی زندگی

---

[1] بالِ جبریل ص ۳۰۷

حاصل ہے۔

سورہ بقرہ آیت ۱۵۴ میں ہے۔

ولاتقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء و لکن لا تشعرون ۝

"اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں انھیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں ہاں تمھیں خبر نہیں۔"

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا[1]

خدا کے پاک بندے یعنی خدا کے نیک بندے ہیں۔ خدا کے نیک بندے ہر حال میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں زرہ ان کا استغنا ہے۔ وہ صرف اللہ پر بھروسہ کرنے والے ہیں۔ ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ۔ "اور جو اللہ پر توکل کرے اللہ اس کے لیے کافی ہے۔" اللہ کے پاک بندے اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ "اور اگر اللہ تم کو کوئی تکلیف پہنچادیں تو سوائے اس کے اور کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے مبذول فرمادیں۔"

وان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ھو وان یردک بخیر فلا راد لفضلہ یصیب بہ من یشاء من عبادہ۔

"یہی وجہ ہے کہ اللہ کے پاک بندے حکومت میں غلامی میں ہر حال میں بے نیاز ہوتے ہیں۔"

رہے ہیں اور ہیں فرعون مری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ مری آستیں میں ہے ید بیضا

(بالِ جبریل[2])

---

[1] بالِ جبریل ص ۳۱۵ [2] ص ۳۱۷

سورہ اعراف آیت ۱۰۸ سورہ شعراء آیت ۳۳ میں ہے۔

وَنَزَعَ یَدَہٗ فَاِذَا ھِیَ بَیۡضَآءُ لِلنّٰظِرِیۡنَ ؕ

"اور موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ گریباں میں ڈال کر نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے سامنے جگمگانے لگا۔"

جس طرح شیطان کے لیے لاحول تازیانہ ہے اسی طرح فرعون کے لیے ید بیضا تازیانہ تھا۔ اقبال اپنے عہد کے فراعلہ کو خبردار کرتے ہیں کہ آج بھی ہماری آستینوں میں ید بیضا موجود ہے۔ اقبال کا یہ نہایت محبوب انداز ہے کبھی وہ دورِ حاضر کے نمرود کو خبردار کرتے ہیں کبھی پرندوں کو اور کبھی فراعنہ کو کہ ان کے لیے ابراہیمؑ، شبیر اور موسیٰ کے معجزات آج بھی موجود ہیں۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ[1]

سورہ طٰہٰ پ۱۶ آیت نمبر ۱، یٰسین سورہ یٰس پ۲۲ آیت نمبر ۱۔

"بعض روایات و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ طٰہٰ، یٰس آنحضرت کے اسمائے گرامی میں سے ہیں[2]"

فرمان : سورہ فرقان آیت نمبر ۱۔

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرًا ۙ

---

[1] بالِ جبریل صـ۳۱۷

[2] معارف القرآن جلد ششم صـ۶۴

"بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے یہ فیصلے کی کتاب (یعنی قرآن) اپنے خاص بندے پر نازل فرمائی تاکہ وہ تمام جہاں والوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔"

دانائے سبل :۔ سورہ نحل آیت ۹ میں ہے

وعلی اللہ قصد السبیل "اور بیچ کی راہ ٹھیک اللہ تک ہے۔"

سورہ فاتحہ آیت ۵ میں ہے اھدنا الصراط المستقیم ہ "ہم کو سیدھی راہ چلا۔" ٹھیک اور سیدھی راہ پر قائم کرنے والے حضورؐ ہی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے (سورہ یٰسٓ آیت نمبر ۳) انک لمن المرسلین علیٰ صراطٍ مستقیم ہ

"بے شک آپ رسولوں میں سے ہیں سیدھی راہ پر۔"

ختم الرسل :۔ سورہ احزاب آیت ۴۰ میں ہے مَا کانَ محمدٌ ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین ۔ "محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہاں اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے آخری نبی ہیں۔"

مولائے کُل :۔ حضورؐ کی تکریم کے لیے کہ وہ کُل کائنات میں افضل و اعلیٰ ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے ہر وقت ان پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔

سورہ احزاب آیت ۵۶ میں ہے ان اللہ وملٰئکتہٗ یصلون علی النبی یآیھا الذین آمنوا صلّوا علیہ وَسلّمو تسلیماً ہ "بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔"

سورہ التین آیت ۱ تا ۵۔

والتّین والزیتون وطور سینین ہ وھذا البلد الامین ہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ہ ثُم رَددُنٰہُ اسفلَ سافلین ہ

"انجیر کی قسم اور زیتون اور طور سینا اور اس امان والے شہر کی قسم بے شک ہم نے انسان کو بنایا خوب سے خوب اندازے پر۔ پھر پھینک دیا اس کو نیچوں سے نیچے۔"

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے انجیر، زیتون کو انسان کی جسمانی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے مذکور فرمایا ہے اور اس کی روحانی صحت کے لیے کوہ سینا کی موسوی ہم کلامی اور

حضور انورؐ کی مکی زندگی کو ایک نمونہ بنا کر پیش فرمایا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی طرح اللہ تعالیٰ کو اس طرح یاد کرنا کہ گویا ہم کلامی ہو رہی ہے اور حضورؐ کی طرح بڑی سے بڑی مشکل کی خوشی اور رغبت سے اور رضائے الٰہی سمجھ کر برداشت کرنا انسانی کمالات کے لیے سب سے بڑا اسوۂ حسنہ ہے اگر ان چیزوں کو انسان اختیار کرے تو وہ "احسنِ تقویم" پر پہنچ جاتا ہے ورنہ اسفل سافلین، دھکیل دیا جاتا ہے۔

حضورؐ نے اللہ کا پیغام پہنچانے میں سب سے زیادہ تکلیفیں اٹھائیں سورہ ہود آیت ۱۱۲ میں حکم ہے فاستقم کما امرت۔" اے حبیب قائم رہ جیسا کہ تمھیں حکم ہے"۔

حضور اکرمؐ دین کی تبلیغ میں جس عشق و مستی سے سرگرم رہے ہیں اس کی مثال اولین و آخرین میں کہیں نظر نہیں آتی۔

سورہ الحدید آیت ۲۔

"ھوالاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیٍ علیم ۵

" وہی اول وہی آخر وہی باطن اور وہی سب کچھ جانتا ہے"۔

اس آیت کے لفظوں سے علامہ اقبال نے استفادہ کیا ہے۔

علامہ اقبال نے اس آیت سے بھی استفادہ کیا ہے۔

شَجَرَۃً تَخرُجُ مِن طُورِ سینآءَ تنبُتُ بالدُّھن وَ صِبغٍ للاٰ کلین ۵

(سورہ مومنون آیت ۲۰۔)

" وہ درخت جو طور سینا پہاڑ سے نکلتا ہے جو تیل نکالتا ہے اور کھانے والوں کے لیے سالن ہے۔"

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن!

(بال جبریل[1])

---

[1] بالِ جبریل صـ ۳۲۳

قرآنِ کریم میں شرک کو سب سے عظیم گناہ قرار دیا گیا ہے۔ مختلف مثالوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے شرک کی بُرائی بیان فرمائی ہے۔ (سورۂ حج آیت ۳۱) میں ہے۔

ومن یُشرک باللہ فکانّما خَرّ مِن السّمآء فتخطفُہُ الطّیرُ اَوْ تھوِی بہ الریح فی مکانٍ سحیق ہ۔ "سنو خدا کے ساتھ شریک کرنے والا گویا آسمان سے گر پڑا اب یا تو اسے پرندے اُچک لے جائیں گے یا ہوا کسی دُور دراز کی جگہ پھینک دے گی" غیر اللہ کے سامنے جھکنا شرک ہے۔ غیر کے آگے جھکنے کا استعارہ اس کی بھی نشان دہی کرتا ہے کہ من تن یعنی رُوح و جسم اللہ کی طرف سے انسان کو عطا ہوا ہے۔ دوسرے کے سامنے اگر جھکے گا تو پھر نہ من اس کا رہے گا اور نہ تن۔"

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے[1]

سورہ احزاب آیت ۳۹ میں ہے

الّذینَ یبلّغون رسلٰت اللہ ویَخشونہٗ ولا یَخشون احداً الّا اللہ ہ

"یہ سب ایسے تھے کہ اللہ کے احکام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے تھے۔

اس آیت میں انبیاؑ اور ان کے وارثین جو اللہ کے احکام دوسروں تک پہنچانے میں مصروف ہیں ان کا بطور خاص ذکر ہے۔ مخلص و حقیقی مومن بھی اس آیت میں شامل ہیں۔ اسلامی تاریخ ہے کہ جب تک مسلمان اللہ سے ڈرتے رہے وہ کسی سے نہیں ڈرے اور جب اللہ کا خوف دل سے نکل گیا تو وہ سب سے ڈرنے لگے۔ براہِ راست یہ شعر کسی آیت سے مستناد نہیں ہے البتہ اقبالؔ کے ذہنی پس منظر میں قرآن کی چند آیتیں اور اسلامی تاریخ ضرور ہیں۔

---

[1] بال جبرئیل ص ۳۲۵

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف
(بالِ جبرئیل[1])

قال خُذہا وَلَا تخف سَنُعِیدُ ھَا سیرتہا الاُولیٰ (آیت نمبر۲۱ سورہ طٰہٰ)

قرآن حکیم میں اور کئی مقام پر اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے جیسے یٰمُوسٰی لاتخف۔ یٰمُوسٰی اقبل ولاتخف، وغیرہ بہرحال مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ یہ ہے: (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا پکڑ لے اس کو اور مت ڈر ہم ابھی اس کو پہلی حالت پر کردیں گے"۔

حضرت موسیٰ نے آٹھ یا دس سال حضرت شعیبؑ کی خدمت کی اس کے بعد اپنی والدہ اور بہن سے ملنے کے لیے مصر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ملک شام کے بادشاہوں سے خطرہ تھا اس لیے عام راستہ چھوڑ کر غیر معروف راستہ اختیار کیا۔ راستے سے ہٹ کر طور پہاڑ کی طرف مغربی اور داہنی سمت میں جا نکلے۔ رات اندھیری، سردی اور برفانی تھی اسی حال میں اہلیہ کو دردِ زہ شروع ہو گیا۔ موسیٰ نے سردی سے بچنے کے لیے آگ جلانا چاہا۔ اسی حیرانی و پریشانی کے عالم میں کوہِ طور پر آگ نظر آئی۔ جو درحقیقت نور تھا۔ جب اس کے پاس پہنچے من جانبِ اللہ آپ کے پاس آواز پہنچی اے موسیٰ میں تمھارا رب ہوں۔ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں عصا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے؟ آپ نے عرض کیا مرے ہاتھ میں عصا ہے اور کبھی میں اس پر سہارا لگاتا ہوں کبھی اس سے اپنی بکریوں کے لیے درختوں کے پتے جھاڑتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ اسے یعنی عصا کو زمین پر ڈال دو۔ زمین پر عصا کے ڈالتے ہی وہ سانپ بن گیا جس سے حضرت موسیٰؑ ڈر گئے اور پیچھے کی طرف بھاگے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہوا اے موسیٰ تم ڈرو نہیں اسے پکڑ لو۔ یہ پھر دوبارہ اصلی صورت میں ہو جائے گا۔

---

[1] بال جبرئیل ص۳۴۲

جس طرح علامہ اقبالؔ نے حضرت ابراہیمؑ کی تعریف میں یہ فرمایا ہے

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

اسی طرح کلیمؑ یعنی حضرت موسیٰ کے بارے میں کہتے ہیں ؎

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

تو اے اسیر مکاں، لامکاں سے دُور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دُور نہیں

(بال جبریل[1])

سورہ ق آیت ۱۶

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید ہ "اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔"

جو اسیر مکاں ہے وہ لامکاں سے قریب کیسے ہو سکتا ہے اس لیے کہ دونوں میں تضاد ہے۔ لیکن اقبال آیت شریفہ سے استدلال کرتے ہیں کہ جس میں کہا گیا ہے کہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ مقصد ہے کہ جمالِ الٰہی کو اگر معرفت حاصل ہو تو ذرا گردن جھکا کر دیکھا جا سکتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے[2]

سورہ تکویر آیت نمبر ۲۹۔

---

[1] بالِ جبریل، ص ۳۴۲ [2] بال جبریل ص ۳۴۷

وما تشاؤن الاّ ان یشآءَ اللّٰہ رب العالمین ٥

"اور تم بغیر خدائے پروردگار عالم کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے"۔[1]

دوسری جگہ بھی یہی مضمون ہے۔ سورہ دہر آیت ۳۰ میں ہے۔

وما تشاؤن الاّ ان یشاء اللّٰہ اِنّ اللّٰہ کانَ علیما حکیماً ٥

" اور تم نہ چاہو گے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے، بے شک اللہ تعالیٰ دانا اور با حکمت ہے"۔ یعنی تمھاری چاہتیں خدا کی چاہت کی تابع ہیں۔ اس آیت کی تشریح میں علامہ جوادی لکھتے ہیں:

"یوں تو انسان کو آزاد اور صاحبِ اختیار بنایا گیا ہے۔ لیکن کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے ارادہ و اختیار کو مکمل طور سے مشیّتِ الٰہی کا پابند بنا دیا ہے اور اس کی مرضی کے خلاف سوچنے کا بھی ارادہ نہیں کرتے ہیں اور یہی ان کے کردار کا کمال اور ان کی عظمت کا راز ہے۔ اس مقام پر اہلِ بیت کا کمال مشیّت الٰہی کی پابندی کو قرار دیا گیا ہے اور واقعتاً یہی ایک بندے کا کمال کردار ہے کہ وہ اپنے کو اپنے مالک کے حوالے کر دے اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ مشیّت الٰہی ان کی مرضی کے تابع ہے کہ خدا بندے کا تابع نہیں ہو سکتا۔ ورنہ خدائی ختم ہو جائے گی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے بندے کی لاج رکھنے کے لیے اس کی مرضی کے مطابق کام انجام دے دیتا ہے کہ اس بندہ کی مرضی اصل میں مرضی پروردگار ہی ہوتی ہے"۔[2]

تازہ پھر دانشِ حاضر سے ہوا سحرِ قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم
(بالِ جبریل)[3]

فَاَلقٰی عصَاہُ فَاِذا ھِیَ ثُعبانٌ مُّبین ٥

---

[1] بالِ جبریل ص ۳۴۷ [2] علامہ جوادی ص ۱۱۹۳ [3] بالِ جبریل ص ۳۵۲

"تب ڈال دیا اس (موسیٰؑ) نے اپنا عصا تو اسی وقت وہ اژدہا ہو گیا صریح"۔[1]

"حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جادو کا بہت زور تھا۔ ابطال سحر کے لیے آپ کو یہ معجزہ دیا گیا کہ جب فرعون کے حکم سے چوٹی کے جادوگر جمع ہوئے اور ان کا موسیٰؑ سے مقابلہ ٹھہرا تو جادوگروں نے اپنے جادو کا بڑے سے بڑا کرشمہ یہ دکھایا کہ انھوں نے کچھ رسّیاں پھینکیں جو سانپوں کی طرح زمین پر حرکت کرنے لگیں۔ حضرت موسیٰؑ نے خدا کے حکم سے اپنی لاٹھی پھینکی جو زمین پر گرتے ہی ایک زندہ اور متحرک سانپ بن گئی۔ یہ سانپ جادوگروں کے چھوٹے چھوٹے سانپوں کی طرف لپکا اور ان سب کو نگل گیا۔

فرعون کو اپنے جادوگروں کی شعبدہ بازی پر بڑا ناز تھا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی نے ان شعبدوں کو ناکام کر دیا اور اپنی معجزانہ کارکردگی سے جادوگروں کے زعم باطل کو خاک میں ملا دیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی تہذیب نے بھی اسی سحر قدیم کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اس تہذیب کی جادو اثری نے اخلاق و کردار کا نقشہ ہی بدل دیا ہے اور اس سے بچنا کسی کے بس کا روگ نہیں رہا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی کسی کلیم (موسیٰؑ) کی لاٹھی کی ضرورت ہے۔ یعنی کوئی ایسا روحانی طاقت کا مالک میدان میں آئے جو لوگوں کے دل سے تہذیب یورپ کے سحر کا اثر مٹا دے"۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

(بالِ جبریل[2])

سورہ ق آیت نمبر ۱۵۔

بل هم فی لبسٍ من خلقٍ جدید ہ "بلکہ وہ لوگ نئی تخلیق کی طرف سے

---

[1] از فضل الٰہی عارف [2] بالِ جبریل صفحہ ۳۶۲

شبہ میں ہیں۔" غلام مصطفےٰ لکھتے ہیں" اقبال نے اسلامی الٰہیات کی نئی تشکیل میں صفحہ ۵۲ پر اس شعر کے لیے مذکورہ آیت سے استدلال کیا ہے۔[۱]"

راقم الحروف نے بہت کوشش کی کہ آیت سے اس شعر کے ربط کو سمجھ سکے اس لیے کہ اقبال کا اشارہ نئی فکر کی تشکیل کی طرف ہے قرآن حکیم نے لوگوں کے شبہات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لیکن غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے یہاں یہ آیت اور شعر ملے اس لیے ان کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

نگاہ پاک تری ہے تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو[۲]

سورہ نور آیت ۳۰، ۳۱ میں ہے۔

۱۔ قل للمومنین یغضّوا من ابصارھم ہ کہہ دے ایمان والے مردوں کو نیچی نگاہ رکھیں۔

۲۔ وقل للمؤمنات یغضضنَ من ابصارھنَّ ہ اور کہہ دے ایمان والی عورتوں کو کہ نگاہ نیچی رکھیں۔

نگاہ کا نیچی رکھنا حیا ہے۔ حیا کا لازمہ طہارت ہے اور طہارت پاکیزگی پیدا کرتی ہے اس طرح غور کیا جائے تو لفظ پاک آئے گا تو اس کا لازمہ حیا، اور طہارت ہے حیا، کا جز اوّل خوف الٰہی ہے اور جز دوم اس کی معرفت ہے اسی لیے اقبال کے کلام میں جگہ جگہ دل کی پاکی، ضمیر کی پاکی یا نگاہ کی پاکی پر زور دیا گیا ہے۔

۱؎ اقبال اور قرآن صفحہ ۶۲۵ ۲؎ بال جبریل صفحہ ۳۶۶

عطا اسلاف کا جذب دروں کر
شریک زمرۂ لا یحزنون کر
(بال جبریل)[1]

اَلَآ اِنَّ اولیاءَ اللّٰہ لا خوفٌ علیھم ولاھم یحزنون ٥

"اولیاء اللہ کو نہ تو دنیا میں کوئی خوف دامن گیر ہوتا ہے اور نہ عاقبت میں انھیں حزن و ملال ہوگا۔" سورہ یونس آیت ۶۳۔

اولیاء اللہ وہ ہیں جن کا تعلق اللہ کی ذات سے استوار ہے چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ اِنَّ الذین قالوا ربنا اللّٰہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملئکۃ اَن لا تخافوا وَلا تحزنوا وَ ابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون ٥

"جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اسی پر قائم رہے اس کے پاس فرشتے یہ کہتے ہوئے آتے ہیں کہ تم کچھ بھی خوف اور غم نہ کرو بلکہ اس جنّت کی بشارت سُن لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔" (سورہ فصلت آیت ۳۰)

ہمارے اسلاف کا یہی جذب دروں تھا جسے طاقت ایمان کہنا چاہیئے تاریخ گواہ ہے کہ ایمان ہی ان کا سرمایۂ حیات تھا اور خوفِ خدا ہی ان کی طاقت تھی جس کی وجہ سے وہ خدا کے سوا کسی طاقت، کسی ظلم اور کسی نقصان کی پروا نہ کرتے تھے۔ اقبال اسی جذب دروں کی تمنا کرتے ہیں اور انھیں لوگوں کے زمرے میں شمار ہونے کی دُعا کرتے ہیں۔ جن کی شان آیت بالا میں بیان ہوئی ہے۔

اقبال کے یہ دو شعر بھی مندرجہ بالا آیتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔

---

[1] بال جبریل ص ۲۷۹

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
(مسجد قرطبہ)

اگر کوئی شعیب آئے میسّر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے
(بالِ جبرئیل)[1]

(۲) نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم اللّٰہی

سورہ طٰہٰ آیت نمبر ۱۱، ۱۰۔

اِذْ رَا نَارًا فقال لاھلہ امکثوا انی اٰنست نارا لعلّی اٰتیکم منھا بقبس او اَجد علی النار ھدی ہ فلمّا اتھا نودی یٰموسٰی اِنّی انا ربّک فا خلع نعلیک ۔" جب کہ انھوں نے ایک آگ دیکھی سو اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ تم ٹھہرے رہو میں نے ایک آگ دیکھی ہے شاید میں اس میں سے تمھارے پاس کوئی شعلہ (آگ) لاؤں یا آگ کے پاس راستہ کا پتہ مجھ کو مل جائے پس جب وہ اس آگ کے پاس پہنچے آواز دی گئی کہ اے موسیٰ میں تمھارا رب ہوں پس تم اپنی جوتیاں اُتار ڈالو ۔"

دوسری جگہ ہے : قَالَ اِنّی ارید ان انکحک احد ابنتیّ ھٰتین علیٰ ان تاجرنی ثمنی حجج فان اتممت عشرًا فمن عندک وما ارید ان اشقّ علیک ط ستجدنی ان

---

[1] بالِ جبرئیل ص ۳۸۰

شَآء اللّٰہ من الصّٰلحین ۝ قَالَ ذٰلکَ بینی وبینکَ اَیما الاجلین قضیت فلا عدوان علیّ و
واللّٰہ علیٰ مانقول وکیل ۝ (سورہ قصص آیت ۲۸، ۲۷)

" اس بزرگ (شعیبؑ) نے کہا میں اپنی ان دولوں لڑکیوں میں سے ایک کو آپ کے نکاح میں دینا چاہتا ہوں اس مہر پر کہ آپ آٹھ سال تک میرا کام کاج کریں۔ ہاں اگر آپ دس سال پورے کریں تو یہ آپ کی طرف سے بطور احسان کے ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ کو کسی مشقت میں ڈالوں۔ خدا کو منظور ہوا تو آپ مجھے آگے چل کر بھلا آدمی پائیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا خیر تو یہ بات میرے اور آپ کے درمیان پختہ ہوگئی میں ان دولوں مدّتوں میں سے جسے پورا کروں مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو۔ ہم یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر خدا گواہ اور کارساز ہے۔"

قبطی کے مرجانے کے بعد حضرت موسیٰؑ کی زندگی کا آغاز شبانی (یعنی بکریاں چرانے) سے ہوا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے دس سال پورے کیے۔ اسی کو اقبالؒ نے تمہید کلیم اللہی کہا ہے اور شبانی سے کلیمی کو دو قدم بتایا ہے۔ اس کا ماخذ قرآنِ کریم ہے۔

صحبتِ اہلِ صفا، نور و حضور و سرور
سرخوش و پُرسوز ہے لالہ لب آبجو!
(دعا[1])

من یطع اللّٰہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصّٰلحین وحَسُنَ اولئک رَفیقاً ۝ (سورہ النساء آیت ۶۹)

" اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے گا جن پر خدا نے نعمتیں نازل کی ہیں۔ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین اور یہی

---

[1] بال جبرئیل ص ۳۸۳

بہترین رفقار ہیں۔"

سورہ النسار کی اس آیت میں جن بہترین رفقار کی طرف اشارہ ہے وہ انبیاء صدیقین، شہدا اور صالحین ہیں۔ یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ ان کے درجات الگ الگ ہیں یا یہ کہ جو صدیق ہے وہ نبی نہیں ہوگا یا جو نبی ہے وہ شہید نہیں ہوگا یا یہ صالحین میں شمار نہیں ہوں گے بلکہ یہ انسانیت کے چار ستون ہیں اور اقبالؔ نے اپنے مندرجہ بالا شعر میں "سرخوشی و پرسوز ہے لالہ لب آبجو!" اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ راہِ حیات میں یہی بہترین رفیق ہیں۔ ظاہر ہے کہ رفیق سے مراد صرف ساتھ بیٹھنا نہیں ہے بلکہ ان کا اتباع ہے۔ اس لیے جب شہید ہوگیا تو اس کا رفیق اب اس مادی دنیا کا انسان نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اب تو کوئی نبی نہیں آئے گا اس لیے انبیار کا کوئی رفیق دور حاضر میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اقبالؔ دراصل اس منہاج کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو ان چاروں کا منہاج ہے جس کے لیے انھوں نے اہل صفا کی ترکیب رکھی ہے۔ "لالہ" کو اقبالؔ نے کئی جگہ شہید کہا ہے۔ چنانچہ ساقی نامہ میں ہے ؏

شہید ازل لالہ خونین کفن

لالہ کو اقبالؔ نے شہید ازل کہا ہے اس طرح استعارہ مبہم نہیں ہے بلکہ واضح ہے۔ ایک نکتہ اور ہے کہ انبیاء نور اور صدیقین، حضور اور شہید و سرور کی منزلوں کے سالک ہوتے ہیں۔ نبوت پیکر نور کے لیے ہے۔ صداقت حضوری پیدا کرتی ہے شہادت وہ کیف سرمدی ہے جس میں سرور ہی سرور ہے اس طرح اقبالؔ نے "دعا" کے اس شعر کو اُردو کی بلاغت محدود کے باوصف قرآن حکیم کی لامحدود بلاغت سے استفادہ کرکے ایک جہاں معنی آباد کیا ہے۔

سلسلۂ روز و شب، نقش گر حادثات

سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات (مسجد قرطبہ)

اِنَّ فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنھارِ لآیات لاولی الباب

سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۹۰۔

"آسمان اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے ہیر پھیر میں یقیناً عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں"۔

یہی رات دن کا ہیر پھیر اور رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونا سلسلۂ روز و شب ہے اور اس کو مرور ایام یا وقت یا زمانہ کہتے ہیں۔ مدت اور زندگی اسی سے سمجھ میں آتے ہیں۔

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

(مسجد قرطبہ)[1]

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات کار جہاں بے ثبات

سورہ رحمٰن آیت نمبر ۲۶

کُلُّ مَن عَلَیھَا فانٍ ہ روئے زمین پر جو ہیں سب فنا ہونے والے ہیں"۔ دنیا کی تمام چیزیں فنا ہو جائیں گی سوائے ذات باری تعالیٰ کے۔ اقبالؔ نے براہ راست استفادہ کیا ہے۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دلوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز

(مسجد قرطبہ)[2]

---

[1] بالِ جبریل ص ۳۸۶ [2] بال جبریل ص ۳۸۹

سورہ مزمل آیت نمبر ۶، میں ہے۔

اِنَّ ناشئۃَ اللیل ھِیَ اَشَدُّ وَطاءً وَّ اَقْوَمُ قیلاً ہ اِنَّ لکَ فی النَّھار سبحاً طویلاً ہ "بے شک رات کا اٹھنا نفس کو خوب کچل دیتا ہے اور بات کو بہت درست کر دیتا ہے۔ یقیناً تجھے دن میں بہت شغل رہتا ہے۔"

تہجد کی نماز کی خوبی یہ ہے کہ دل اور زبان ایک ہو جاتا ہے اور تلاوت کے جو الفاظ زبان سے نکلتے ہیں دل میں گڑ جاتے ہیں اور بہ نسبت دن کے رات کی تنہائی میں معنی و مطلب خوب ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں رات اذکار اور دن اشغال کے لیے اور دونوں کا مرکز اللہ کی رضا کا حصول ہے اور بندۂ مومن اسی رضا کا طالب ہوتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز
(مسجد قرطبہ)[1]

سورہ فتح آیت نمبر ۱۰ میں ہے

اِنَّ الذین یبایعونکَ اِنّما یبایعون اللّٰہ ید اللّٰہ فوقَ اید یھم۔

"جو لوگ تجھ سے بیعت کر رہے تھے وہ یقیناً اللہ ہی سے بیعت کر رہے تھے ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا۔" ایک دوسری آیت ہے ان ینصرکم اللّٰہ فلا غالب لکم وان یخذ لکم فمن ذالذی ینصرکم من بعدہٖ وعلی اللّٰہ فلیتوکلِ المومنین ہ

سورہ آل عمران آیت ۱۶۰۔

"اگر اللہ تمھاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہو سکے گا اور اگر مدد نہ کرے تمھاری تو اس کے بعد پھر ایسا کون ہے جو تمھاری مدد کر سکے اور مسلمان کو صرف اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا

---

[1] بال جبریل ص ۳۸۹

چاہیے۔" مذکورہ پہلی آیت بیعت رضوان کے متعلق ہے۔ ایک مرتبہ حضور اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ مدینے سے طواف کعبہ کی نیت سے مکہ کی طرف چلے ابھی مکہ شریف کوئی نو میل دور تھا۔ آپؐ نے حضرت عثمان غنیؓ کو سفیر بنا کر قریش مکہ کی طرف بھیجا ادھر مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے اس لیے حضور اکرمؐ نے بے سرو سامان مسلمانوں سے جاں نثاری کی بیعت لی یعنی اگر لڑنا پڑے تو وہ ثابت قدم رہیں گے۔ یہ بیعت مقام حدیبیہ میں ایک درخت کے نیچے لی گئی تھی۔ مذکورہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں نے حضورؐ سے بیعت نہیں کی بلکہ انھوں نے اللہ سے بیعت کی ہے اور بیعت کے وقت ان کے ہاتھوں پر رسول کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ خود اللہ کا ہاتھ تھا۔

دوسری آیت میں بھی مضمون وہی ہے۔ مومن کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہونا دراصل اللہ کی مدد ہے اللہ کی مدد کے بعد کوئی بھی اسے مغلوب نہیں کر سکتا۔ وہ کارکشا اور کارساز ضرور ہو کر رہے گا۔ اقبالؔ نے پہلی آیت سے براہِ راست استفادہ کیا ہے۔

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دل نواز

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

(مسجد قرطبہ[1])

ان اشعار میں بندۂ مومن کے صفات گنائے گئے ہیں۔ مومن کو مقصد تخلیق معلوم ہے۔ ربّنا ما خلقت هذا باطلاً۔ "اے میرے پروردگار تو نے اس دنیا کو یوں نہیں پیدا کیا۔" اس لیے اس کے مقاصد اعلیٰ و ارفع ہیں۔ مومن زندگی کی حقیقت سے واقف ہے۔ مومن کو معلوم ہے کہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں بہت ہی مختصر ہے اس لیے

---

[1] بال جبریل صفحہ ۳۸۹

اس کی اُمیدیں قلیل ہیں۔ وماھذہٖ الحیوۃ الدُّنیا الاّ لھو ولعب الدّار الآخرۃ لھی الحیوان لوکانوا یعلمون[1] ٥ "دُنیا کی زندگی تو محض کھیل تماشہ ہے۔ البتہ سچی زندگی تو آخرت کا گھر ہے کاش کے جان لیتے"۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ بات بتلائی کہ واللہ یحب المحسنین۔ واللہ یحب المتقین۔ چونکہ مومن اللہ کی پیروی کرتا ہے۔ اللہ کی بات مانتا ہے اس لیے اس کی ہر ادا دلفریب اور رنگ دلنواز ہے فرمایا قُل اِن کُنتم تحبون اللہ فاتبعونی یُحبِبکُمُ اللہ ٥ (سورہ آل عمران آیت ۳۱) "آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری تابع داری کرو خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا"۔ سورہ فرقان میں عباد الرحمٰن کے صفات میں یہ بھی بتایا گیا کہ وہ بہت منکسر المزاج ہوتے ہیں۔ زمین پر چلتے ہیں تو اکڑتے نہیں جب کسی جاہل سے سابقہ پڑ جائے تو سلام کر کے آگے نکل جاتے ہیں۔

مومن اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا اس لیے آخر دم تک اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کرتا ہے۔ نماز کا وقت ہو تو جھک جاتا ہے۔ دُشمن سے مڈبھیڑ ہو جائے تو سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ یہ سارے خیالات قرآن مجید میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ اقبال نے براہِ راست کسی آیت سے استفادہ نہیں کیا مگر ان کے ذہنی پس منظر میں قرآن کے مندرجہ بالا آیتیں ضرور موجود ہیں۔

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں
(مسجد قرطبہ)[2]

اِنّکَ لعلیٰ خُلقٍ عظیم۔ (سورہ القلم آیت نمبر ۴)
"بے شک تو بہت عمدہ اخلاق پر ہے"۔

آپ کی جبلت اور پیدائش ہی میں خدائے عالم نے پسندیدہ اخلاق، بہترین خصلتیں

---

[1] سورہ عنکبوت۔ آیت نمبر ۶۴۔ [2] بالِ جبریل صفحہ ۳۹۰

اور پاکیزہ عادتیں رکھی تھیں تو اس طرح آپ کا عمل قرآن پر ایسا تھا کہ گویا احکامِ قرآن کا مجسمہ عملی نمونہ آپ ہیں۔ ہر حکم کو بجا لانے اور نہی سے رک جانے میں آپ کی حالت یہ تھی کہ گویا قرآن میں جو کچھ ہے وہ آپ کی عادتوں اور آپ کے کریمانہ اخلاق کا بیان ہی ہے حضور اکرمؐ سب سے زیادہ خوش خلق تھے۔ آپؐ ارشاد فرماتے ہیں "میں بہترین اخلاق اور پاکیزہ ترین عادتوں کو پورا کرنے کے لیے آیا ہوں"۔ حضرت عائشہؓ سے اخلاق نبوی کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو آپ فرماتی ہیں کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا۔ آپؐ کا خلق قرآن تھا۔ اقبالؔ نے حامل خلق عظیم کہہ کر ان صفات کو بیان کیا ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
(طارق کی دعا)[1]

قرآن کریم میں جگہ جگہ شہادت اور اللہ کے راستے میں جہاد وغیرہ کی ترغیب موجود ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ آیت ۱۵۴ میں ہے۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاءٌ ولکن لا تشعرون۔

"اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں انھیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں ہاں تم کو خبر نہیں"۔

اس آیت کریمہ میں شہید کو دائمی زندگی کی بشارت دی گئی ہے مگر اقبالؔ کے شعر میں مومن کا مطلوب و مقصود شہادت قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں جب ہم یہ آیت پڑھتے ہیں۔ ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ ویقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون ط "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں"۔ (سورہ توبہ آیت نمبر ۱۱۱)

---

[1] بال جبریل صـ ۳۹۷

اس آیت کے اندر مومن کے دوسری صفات کے علاوہ قتل کرنا اور قتل کیا جانا بھی بتلایا گیا ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ مومن کو شہادت کا درجہ اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ اس کی نیت نہ تو مال پر ہو اور نہ حکومت و اقتدار پر۔ اس لیے عام طور سے جہاد کا جو مطلب مغربی مورخین نے بیان کیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ مومن تسخیر ممالک کے لیے یا مال غنیمت کے لیے جہاد پر آمادہ نہیں ہوتے بلکہ ان کا مقصد شہادت ہے یعنی ایک طرف اللہ کی گواہی (شہادت یا گواہی) اور دوسری طرف شہادت یعنی اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا۔

دل مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کی تھی نعرۂ "لاتذر" میں
(طارق کی دعا)[1]

سورہ نوح آیت ۲۶، ۲۷ میں ہے۔

وقال نوح رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیّاراً ○ انّک ان تذرھم یضلو عبادک ولا یلدو الاّ فاجراً کفّاراً ○

"اور حضرت نوحؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار تو روئے زمین پر کسی کافر کو رہنے سہنے والا نہ چھوڑ۔ اگر تو انھیں چھوڑ دے گا تو یقیناً یہ تیرے اور بندوں کو بھی گمراہ کردیں گے اور ان کے ہاں جو بال بچے ہوں گے وہ بھی بدکار اور ناشکرے ہوں گے۔"

حضرت نوحؑ کی قوم کی سرکشی، ضد، ہٹ دھرمی حد سے بڑھ گئی یہاں تک کہ آپ نے یہ جان لیا کہ یہ سب کے سب گمراہ ہی رہیں گے اور اس کے بعد کی آنے والی نسل بھی گمراہ ہوگی اس لیے بہتر ہے کہ ان کے اوپر عذاب نازل ہو اس لیے آپ نے ان کے حق میں بد دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بھیانک سیلاب وطوفان بھیجا یہاں تک کہ حضرت نوحؑ کا بیٹا بھی غرق آب ہوگیا۔ یہ دراصل حضرت نوحؑ کا مذہبی جوش و جذبہ تھا۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ

---

[1] بال جبریل ص ۳۹۷

سارے انسان اللہ کے نام لیوا ہو جائیں اسی کی فرمانی برداری کریں۔ مگر جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت میں دیکھا تو زبان سے بد دعا نکل گئی۔ ہر مرد مومن میں وہی دین کی تڑپ پیدا ہو جائے وہی جستجو ہو جو حضرت نوحؑ کے سینے میں پوشیدہ تھی۔ علامہ اقبالؔ اسی کی تمنا کرتے ہیں۔

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات
(لینن خدا کے حضور میں[۱])

سورہ بقرہ، آیت ۲۷۵ میں ہے۔

اَلَّذِینَ یاکلون الرّبوا لا یقومون الاّ کما یقوم الّذی یتخبّطہُ الشیطٰن من المسّ۔ ذلکَ بانّھم قالوا انّما البیع مثل الرّبوا واحل اللّٰہ البیع وحرّم الرّبوا۔

" جو لوگ سود کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان نے خبطی بنا دیا ہو لپٹ کر (یعنی حیران و مدہوش) یہ سزا اس لیے ہوگی کہ ان لوگوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔"

سود سے جو بظاہر فائدہ دکھائی دیتا ہے وہ اصل میں تمام سماج کے لیے مرگ مفاجات ہے۔ اسلام کے رو سے گناہ کا موجب اور قابل سزا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا اقبالؔ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ ترے محیط میں حباب
(ذوق و شوق[۲])

۱؎ بالِ جبریل ص ۳۹۹ ۲؎ بال جبریل ص ۴۰۵

سورہ بروج آیت نمبر ۲۲، ۲۱، ۲۰۔

واللہ من ورائہم محیط ٥ بل ھو قرآن مجید ٥ فی لوح محفوظ ٥

"اللہ تعالیٰ بھی انھیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے بلکہ یہ قرآن ہے بڑی شان والا لوح محفوظ میں لکھا ہوا۔"

سورہ القلم آیت نمبر ۱، ۲۔

نٓ والقلم وما یسطرون "نون اور قسم ہے قلم کی اور اس کی جو کچھ کہ وہ (فرشتے) لکھتے ہیں۔"

اقبالؔ نے ان آیتوں کے الفاظ اور ترکیب سے استفادہ کیا ہے اور سرکار دو عالمؐ کو لوح و قلم کہا ہے اور گنبد آبگینہ رنگ کو حضورؐ کی ذات کی وسعت میں صرف حباب سے تعبیر کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ سرکار کی مدح کے لیے اقبالؔ نے قرآن سے الفاظ مستعار لیے اور یہی کمال بلاغت ہے۔

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دار نذیری
(بال جبریل[1])

افرنگ ز خود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری! تو نذیری

سورہ سبا آیت ۲۸ ہیں:

وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا ولٰکن اکثر الناس لا یعلمون۔

"ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوش خبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے ہاں یہ صحیح ہے کہ لوگوں کی اکثریت بے علم ہے[2]۔"

---

[1] ص ۲۱۰ [2] ترجمہ تفسیر ابن کثیر، جلد چہارم۔

"بشیر و نذیر" سرکار دو عالمؐ کے القاب ہیں۔ اقبال نے اسی آیت سے استفادہ کرتے ہوئے دوسرے شعر میں یہ بھی بتایا ہے کہ بشارت اور ڈرانے میں وہی نسبت ہے جو جلال و جمال میں ہے جنھیں بشارت نہیں دی گئی ہے ظاہر ہے کہ ان کے لیے ڈر ہی ڈر ہے۔

الارض للہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟

کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب[1]؟

زمین و آسمان کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی ہیں اور وہی ان کا پالنہار ہے قرآن حکیم میں یہ باتیں جگہ جگہ موجود ہیں چند آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔

سورہ واقعہ آیت نمبر ۶۳، ۶۴ میں ہے۔

افرءیتم ما تحرثون ۝ ءانتم تزرعونہٗ ام نحن الزارعون ۝

" اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو کچھ بوتے ہو اسے تم ہی اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں " سورہ واقعہ آیت نمبر ۶۹، ۶۸ میں ہے۔

افرءیتم الماء الذی تشربون ۝ ءانتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون ۝

" اچھا یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اسے بادلوں میں بھی تم ہی اتارتے ہو یا ہم برساتے ہیں ؟ "۔

سورہ مریم میں ہے : انا نحن نرث الارض ومن علیھا والینا یرجعون ۔

---

[1] بال جبریل ص۱۴۱

"بیشک تمام زمین اور زمین پر رہنے والوں کے وارث ہم ہی رہ جائیں گے اور یہ سب ہمارے پاس ہی لوٹائے جائیں گے۔"

اقبالؔ نے نہ صرف ان آیات سے استفادہ کیا ہے بلکہ وہی انداز بھی اختیار کیا ہے۔ اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ زمین صرف اللہ ہی کی ہے اور ہم چند دن کے وارث ہیں اور یہ تمام چیزیں ہمارے پاس بطور امانت ہیں۔ اقبالؔ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں اپنے خیال کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

مذاق دوئی سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

(ساقی نامہ[1])

سُبْحٰنَ الَّذِی خلق الازواج کُلَّھَا مِمَّا تنبت الارضُ وَمِنْ انفسھم وَمِمَّا لا یَعلمون۔
سورہ یٰسٓ آیت نمبر ۳۶۔

"پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی اگائی ہوئی چیز ہو خواہ خود ان کے نفوس ہوں خواہ وہ چیزیں ہوں جنھیں یہ جانتے بھی نہیں۔"
دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خلقنا زوجین لَعَلَّکُم تَذکّرون ٥ (سورہ ذاریات آیت ۴۹)

"اور ہر چیز کو ہم نے جوڑ جوڑ پیدا کیا تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔" قرآن کریم میں اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے کئی جگہوں پر بیان کیا ہے۔ دنیا کی تمام مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے زوج زوج پیدا کیا ہے۔ آسمان زمین، رات دن، سورج چاند، خشکی تری، اجالا اندھیرا،

---

[1] بال جبریل صد ۴۱۹

ایمان کفر، موت حیات، بدی نیکی، جنت دوزخ۔ یہاں تک کہ حیوانات اور نباتات کے بھی جوڑے ہیں۔ پس ان جوڑوں ہی کی وجہ سے اس دنیا میں اژدھام اور رونق ہے۔

خودی کے نگہبان کو ہے زہرناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند[1]

والذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین آوَوْ و نصروا اولٰئکَ ھم المومنونَ حقّاً لھم مغفرۃٌ وّرِزقٌ کریم[2]

(آیت ۴، سورہ انفال)

" اور جن لوگوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت اور راہِ خدا میں جہاد کیا اور پناہ دی اور نصرت کی وہی درحقیقت واقعی مومن ہیں اور انھیں کے لیے مغفرت اور باعزت رزق ہے۔"

مومن کے صفات یہ بتائے گئے۔

۱۔ ایمان۔
۲۔ مہاجر۔
۳۔ مجاہد۔
۴۔ سایہ شمشیر میں اس کی پناہ لاالہ الااللہ (پناہ دینے والے)۔
۵۔ نصرت کرنے والے۔
۶۔ مومن کے لیے باعزت رزق ہے۔

---

[1] ساقی نامہ بال جبرئیل ص ۴۲۰

جس کو نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا

(جبرئیل وابلیس)[۱]

قُل یٰعبادیَ الّذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطو مِن رحمۃ اللّٰہ اِنّ اللّٰہ یغفرالذنوب جمیعاً ط انہ ھوالغفورُ رّحیم (سورہ زمر آیت ۵۳)

"میری جانب سے کہہ دو کہ اے مرے وہ بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی تم اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو جاؤ بالیقین اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے واقعی وہ بڑی بخشش بڑی رحمت والا ہے۔"

اقبالؔ نے اس آیت شریفہ سے تقنطوا اور لاتقنطوا کی ترکیب وضع کی ہے۔ اس آیت کے اندر انسان کو مایوسی کا شکار نہ ہونے کے لیے کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے ۔اِنّہٗ لا یایئسُ مِن روح اللّٰہ اِلاّ القوم الکٰفرون ۔ یعنی کفار ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں یہ ہے کہ مومن رجا اور خوف کے درمیان ہوتا ہے۔ پس آیت شریفہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان مایوس ہو کر نہ بیٹھ جائے، بلکہ جدوجہد جاری رکھے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ وہ آدمی جو مایوس ہو کر ہی کچھ عمل کر سکتا ہے اس کے حق میں مایوسی بہتر ہے یا مایوس نہ ہونا۔

واقف ہو اگر لذتِ بیداریٔ شب سے
اونچی ہے ثریّا سے بھی یہ خاکِ پُراسرار

(اذاں)[۲]

سورہ مزمّل آیت ۶ میں ہے

اِنّ ناشئۃ الّیل ھی اَشَدُّ وَطاءً وَّاقوم قیلاً ہ "بے شک رات کا اُٹھنا

۱؎ بال جبرئیل ص ۴۳۶ ۲؎ بال جبرئیل ص ۴۳۷

نفس کو خوب کچل دیتا ہے اور بات کو بہت درست کر دیتا ہے"۔ دوسری جگہ ہے۔
وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝
سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۹۔

" اور رات کے کچھ حصے میں تہجد پڑھیے یہ خاص آپ کے لیے زیادہ ہے قریب ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقام محمود میں کھڑا کر دے"۔ بیداریٔ شب سے انسان کے مرتبے بلند ہوتے ہیں۔ تہجد کی نماز کی بڑی فضیلت ہے۔ تہجد کی نماز کی بڑی خوبی یہ ہے کہ دل اور زبان ایک ہو جاتا ہے اور تلاوت کے جو الفاظ زبان سے نکلتے ہیں دل میں گڑ جاتے ہیں اور بہ نسبت دن کے رات کی تنہائی میں معنی و مطلب خوب ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ رات کے وقت انسان کا تعلق براہِ راست خدا سے ہو جاتا ہے۔ مقام محمود سب سے اعلیٰ مقام ہے جہاں پر حضور اکرمؐ شفاعت کرائیں گے۔ بیداریٔ شب گویا کہ ذریعہ ہے مقام محمود یا بلندیٔ مقام کا۔

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن
(خانقاہ)[1]

قُم باذن اللہ

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قم باذن اللہ
وہی زمیں وہی گردوں ہے قم باذن اللہ

کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے قم باذن اللہ

غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قم باذن اللہ[2]

۱۔ بال جبریل صـ ۴۵۳ ۲۔ ضرب کلیم صـ ۵۲۷

واُحی الموتیٰ باذن اللہ "اور جِلاتا ہوں مُردوں کو اللہ کے حکم سے"۔
(سورہ آل عمران آیت نمبر ۴۹۔

حضرت عیسیٰؑ کا ایک معجزہ تھا کہ وہ خدا کے حکم سے مُردوں کو (قُم) اٹھ کہہ کر زندہ کرتے تھے۔ آیت کے الفاظ ہیں "اُحی الموتیٰ باذن اللہ" تفسیر میں اختلاف ہے کہ آیا جب وہ خدا کے حکم سے "قُم" کہتے تھے تو مُردہ زندہ ہو جاتا تھا یا صرف ایک آدھ واقعہ ایسا پیش آیا۔ بعض صوفیوں نے مردہ زندہ کرنے کے مجازی معنی بھی لیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جو لوگ اخلاقی لحاظ سے مُردہ ہو چکے تھے انھیں حضرت عیسیٰؑ نے تعلیم الٰہی سے زندہ کیا۔ بہرحال حقیقت خواہ کچھ ہو یہاں صرف قُم باذن اللہ سے بحث ہے اور اقبال نے جہاں کہیں یہ لفظ استعمال کیا ہے اس کے مجازی معنی مراد لیے ہیں یعنی اپنی قوم کو اخلاقی لحاظ سے مُردوں کے مشابہ دیکھ کر تعلیم خداوندی کی صدائے قُم سے جو کسی مردِ حق پرست کے مُنہ سے نکلے زندہ کرنا چاہتے ہیں اور اس میں از سرِ نو زندگی کے آثار دیکھنے کے متمنّی ہیں[1]۔"

ہزار چشمے ترے سنگِ راہ سے پھوٹیں
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر[2]

سورہ بقرہ آیت نمبر ۶۰ میں ہے:

واذا استسقیٰ موسیٰ لقومہٖ فقلنا اضرب بعصاکَ الحجر ط فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عیناً ط قد علم کل اناس مشربھم کلوا واشربوا من رّزق اللہ ولا تعثوا فی الارض مُفسدین ٥

"جب حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے پانی کا مطالبہ کیا ہم نے کہا اپنے عصا کو پتھر پر مار جس کے نتیجے میں بارہ چشمے جاری ہو گئے اور سب نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا۔ اب ہم نے کہا کہ من و سلویٰ کھاؤ اور چشمہ کا پانی پیو، روئے زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔"

---

[1] "متاعِ اقبال" ص ۲۵۳ فضل الٰہی عارف۔ [2] ضربِ کلیم ص ۴۶۳

مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ وادیٔ تیہہ میں پیش آیا جہاں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تمام بنی اسرائیل تھے۔ جب ان کو پیاس لگی تو انھوں نے حضرت موسیٰؑ سے پانی کا مطالبہ کیا۔ اقبالؔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اگر خودی میں استحکام پیدا ہو جائے تو ایسے چشمے اب بھی جاری ہو سکتے ہیں۔

تو معنیٔ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

(معراج[1])

سورہ النجم آیت نمبرا وَالنَّجم اذا ھویٰ ۵ "اور ستارے کی قسم جب وہ گرے"۔

اس آیت کی سورۃ کا نام ہی النجم ہے اس صورت میں رسول اکرمؐ کے اعلےٰ مراتب اور شان و عظمت کا ذکر ہے۔ جس طرح آسمان کے ستارے طلوع سے غروب تک اپنے معیّن راستے معیّن رفتار سے چلے جاتے ہیں۔ آفتاب نبوّت بھی اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے راستے پر برابر چلتا رہتا ہے۔ انبیاء آسمان نبوّت کے ستارے ہیں جن کی روشنی اور رفتار رہنمائی کرتی ہے اور جس طرح تمام ستاروں کے غائب ہونے کے بعد آفتاب طلوع ہوتا ہے ایسے ہی تمام انبیار کے بعد آفتاب محمدؐ طلوع ہوا۔ حضورؐ کی گفتار و کردار بھی حکم الٰہی کے ماتحت ہے۔ نہ حضورؐ کی زبان مبارک سے کوئی ایسا لفظ نکلتا ہے جو خواہشات نفس پر مبنی ہو اور نہ کوئی کام حکم الٰہی کے خلاف کرتے ہیں۔ نجم کی مثال سے حضورؐ کی شان و عظمت کا بیان مقصود ہے جس کا منتہی یہ ہے کہ آپ کو شبِ معراج میں خدا نے آسمانوں کی سیر کرائی اور اپنی قدرت کے وہ مناظر دکھائے جو کسی انسان نے نہ دیکھے نہ دیکھ سکتا ہے پھر خدا کی طرف سے پیغام لانے والے فرشتے جبریل کو اپنے

---

[1] ضرب کلیم ص۴۷

روبرو ان کی اصل شکل میں دیکھا یہ دونوں باتیں آپ کی غیر معمولی کمالات پر دلالت کرتی ہیں اور والنجم میں حضورؐ کی انقلاب آفریں تعلیم کی طرف اشارہ ہے۔

اقبالؔ کے یہاں ستارہ ان کے مخصوص نظام فکر کی علامت ہے۔ چنانچہ کلیات میں جب "شام کے تارے پہ جب پڑتی ہے رہ رہ کر نظر"[1] مقدر کے ستارے کا چمکنا"[2] "آسماں سے اُڑ اُڑ کر ستارہ آیا"[3] صبح کا ستارہ، غرض ۱۹۰۵ء تک ستارہ اُردو کی روایتی شاعری کے انداز میں اقبالؔ کے یہاں نظر آتا ہے لیکن ۱۹۰۵ء کے بعد سے "اخترِ سحر" رازدار فلک بھی ہے اور اس کی بساط حباب کا نقش اور شرارے کی تابندگی ہے۔ تارے چاند سے گفتگو کرتے ہیں اور چلنا مدام چلنا کہہ کر اپنی فطرت کی تشریح کرتے ہیں۔ ستارہ کے عنوان سے جو نظم ہے یا دو ستارے کے نام سے جو نظم ہے ان سب میں تغیر، تحرک گردش کا فلسفہ چھپا ہوا ہے اسی طرح چاند پر جو نظم ملتی ہے۔ اس میں تاروں کی خاموشی کا تذکرہ ہے۔ بزم انجم میں جذب باہمی سے نظام کا قیام تاروں کی زندگی سے اخذ کیا گیا ہے۔ ستارے سے اقبالؔ کی چشمک قائم رہتی ہے۔ وہ ستارے کو مقدر کا علمبردار نہیں سمجھتے۔ ستارہ انسان کی تقدیر کی خبر نہیں دے سکتا۔ وہ خود فراخیٔ افلاک میں خوار و زبوں ہے۔ لیکن پروردگار نے جب ستارے کی قسم کھائی ہے تو بہرحال ستارہ اہم ضرور ہے اور وہ ستارہ بھی اہم ہے جو آسماں سے زمین کی طرف چلا اور گرا۔ اسی لیے اقبالؔ نے ستارے کی اہمیت اور نگاہِ قدرت میں اس کی محبوبیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے کلام کا استعارہ بنا لیا۔

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے علّم الاسماء
(ذکر و فکر)[4]

وعلّم آدم الاسمآءَ کلّھا ثمّ عرضھم علی الملئکۃ فقال انبئونی باسمآءِ ھٰؤلاء ان کنتم صٰدقین ○ (سورہ بقرہ آیت ۳۱)

---

[1] رخصت اے بزم جہاں [2] بلال رضؓ [3] جگنو۔ [4] ضربِ کلیم ص ۴۸۵

"اور آدم کو اللہ تعالیٰ نے تمام اسمار کی تعلیم دی اور پھر ان سب کو ملائکہ کے سامنے پیش کر کے فرمایا کہ ذرا ان سب کے نام بتاؤ اگر تم اپنے خیال استحقاق میں سچے ہو۔" فرشتوں نے آدمؑ کی تخلیق پر اعتراض کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ چنانچہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی یعنی چند چیزوں کے نام سکھائے پھر فرشتوں کے سامنے رکھ دیا کہ اچھا اب ان کے نام تو بتاؤ مگر وہ کہاں بتا سکتے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تعلیم دے کر فرشتوں کے سامنے ان کی عزت و مرتبہ کو بلند کیا جس کی طرف علامہ اقبالؔ نے مندرجہ بالا شعر میں اشارہ کیا ہے۔

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم!
(فقر و ملوکیت)

سورہ شعرار آیت نمبر ۸۹، ۸۸۔

یوم لا ینفع مالٌ وّلا بنون ٥ اِلّا مَنْ اتی اللّٰہ بقلبٍ سلیم ٥

"جس دن کہ مال اور اولاد کچھ کام نہ آئے گی لیکن فائدہ والا وہی ہوگا جو خدا تعالیٰ کے سامنے بے عیب دل لے کر جائے۔"

سورہ صفٰت آیت ۸۳، ۸۴

وان من شیعتہٖ لابراھیم ٥ اِذْجاءَ ربّہٗ بقلبٍ سلیم ٥

"فوج کی تابعداری کرنے والوں میں سے ہی ابراہیم بھی تھے جب کہ وہ اپنے رب کے پاس بے عیب دل لائے۔"

اقبالؔ نے مندرجہ بالا آیتوں سے "قلب سلیم" کی ترکیب وضع کی ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں کچھ بھی نہیں
(التصوف[1])

سورہ حجرات آیت نمبر ۱۴ میں ہے :

قالت الاعراب آمنّا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولمّا یدخل الایمان فی قلوبکم ٥ " دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے تو کہہ کہ درحقیقت تم ایمان نہیں لائے لیکن تم یوں کہو کہ ہم (مخالفت چھوڑ کر) مطیع ہو گئے کیوں کہ ابھی تک تمھارے دلوں میں ایمان داخل ہی نہیں ہوا "۔

مسلمان ہونے کے لیے دل وزبان کا ایک ہونا انتہائی ضروری ہے۔ صرف زبانی اقرار ناکافی ہے چنانچہ سورہ منافقون میں ارشاد ہے۔ اذا جاءک المنافقون قالوا نشھد اِنّکَ لرسول اللّٰہ واللّٰہ یعلم انّک لرسولہ واللّٰہ یشھد ان المنافقین لکذبون۔"

" تیرے پاس جب منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اللہ جانتا ہے کہ یقیناً تو اللہ کا رسول ہے۔ اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں[2]۔" یعنی دل سے ماننے والے نہیں ہیں۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات
(نماز[3])

سورہ زُمر آیت ۲۹۔

ضرب اللّٰہ مثلاً رجلاً فیہ شُرکاء متشٰکسون ورجلاً سلماً لرجلٍ ھل یستوین

---

[1] ضرب کلیم ص ۲۹۷ [2] سورہ منافقون آیت نمبر ۱۔

مثلاً ط الحمد للہ بل اکثرھم لا یعلمون۔

" اللہ نے اس شخص کی مثال بیان کی ہے جس میں بہت سے جھگڑا کرنے والے شرکاء ہوں اور وہ شخص جو ایک ہی شخص کے سپرد ہو جائے کیا دونوں حالات کے اعتبار سے ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ ساری تعریف اللہ کے لیے ہے مگر ان کی اکثریت سمجھتی نہیں ہے۔"

توحید اور شرک کی بہترین مثال ہے کہ توحید پرست ایک خدا کا بندہ ہوتا ہے، شرک اپنے ساتھ مختلف قسم کی غلامی کا بوجھ لاد لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ توحید کے تقاضوں پر عمل ممکن ہے لیکن شرک کے تقاضوں پر عمل کا امکان نہیں ہے اس میں زندگی متضاد راستوں پر چلنے لگتی ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد "اکثرہم لا یعلمون" یعنی اکثریت نہیں سمجھتی" نہ سمجھنے میں غلط سمجھنا بھی شامل ہے۔ ایک سجدہ کو گراں سمجھنا" لا یعلمون" کی بڑی اچھی مثال ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق[1]

سورہ حٰمٓ سجدہ (فصلت) آیت نمبر ۵۳ میں ہے۔

سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتّٰی یتبیّن لھم انّہ الحق ط۔

"عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذاتوں میں بھی یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ حق یہی ہے۔"

اس آیت شریفہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آفاق اللہ کی ایک نشانی ہے لیکن یہ نشانی انفس میں بھی موجود ہے۔ اس طرح آفاق، انفس میں بھی موجود ہے اور یہی ایمان کا اہم ترین پہلو ہے کہ ساری کائنات سمٹ کر سویرائے دل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ آفاق علامت ہے مادی اعتبار کی۔ مومن کی اپنی دنیا میں یہ سارے اعتبارات سموئے ہوئے ہیں۔ کافر انھیں اعتبارات کا غلام بن جاتا ہے۔

---

[1] ضرب کلیم ص ۵۰۶

ایک جگہ اقبال نے اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے :

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دنیا فغانِ صبح گاہی

تری دنیا میں میں محکوم و مجبور
مری دنیا میں تری پادشاہی

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!
(مومن[1])

سورہ فتح آیت ۲۹ میں ہے :

وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ۔

" اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت، ہیں آپس میں رحم دل "۔

حضور اکرمؐ کی تعلیمات کی بدولت صحابہ کرامؓ میں یہ شان پیدا ہو گئی کہ جب وہ کفار سے برسرِ پیکار ہوتے تو نہایت سختی اور دلیری کے ساتھ برخلاف مومن کے۔ ان کا باہمی برتاؤ وسلوک نہایت رحم دلانہ تھا اور مومن کی شان بھی یہی ہے۔ اقبال نے اپنے شعر میں انھیں اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ مندرجہ بالا آیت شریفہ سے براہِ راست استفادہ کیا گیا ہے۔ مگر افسوس کہ آج کے مومن کی شان اس کے بالکل برعکس ہے۔ ع

تم ہو آپس میں غضبناک وہ آپس میں رحیم

حرفِ استکبار ترے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا مرا سجود
(تقدیر[2])

---

[1] ضرب کلیم ص۵۰۸ [2] ضرب کلیم ص۵۰۹

سورہ بقرہ آیت ۳۴ میں ہے۔

ابیٰ وَاستکبَرَ وکانَ من الکٰفرین ۝ "اس (ابلیس) نے آدمؑ کے آگے جھکنے سے انکار کیا اور تکبّر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا"۔

اس شعر میں لفظ "استکبار" مندرجہ بالا آیت سے مستفاد ہے۔ رہا ابلیس کا قول کہ "تری مشیت میں نہ تھا مرا سجود" اس طرح کا کوئی تصوّر قرآن حکیم سے نہیں ملتا۔ قرآن کریم نے ہمیں صرف یہ بتایا ہے کہ ابلیس نے گھمنڈ کیا اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا"۔

ابلیس کا کام تاویل کرنا ہے اور یہ بھی اس کی تاویل کا انداز ہے کہ اے پروردگار تری مشیّت میں مرا سجدہ نہ تھا اس لیے میں نے سجدہ نہ کیا۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں

(مدنیت اسلام[۱])

سورہ انبیاء آیت نمبر ۹۰۔

انّھم کانوا یسارعون فی الخیرات ویدعوننا رغباً ورھباً وکانوا لنا خاشعین ۝

"یہ سب (انبیاء جن کا اس صورت میں ذکر ہوا ہے) نیک کاموں میں دوڑتے تھے اور اُمید و بیم کے ساتھ ہماری عبادت کیا کرتے تھے اور ہمارے سامنے دب کر رہتے تھے"۔

اندیشہ نام ہے فعلیت عقل کا اور جنون نام ہے شدّت محبت کا مومن کو حق تعالیٰ سے شدید محبت ہوتی ہے۔ اَلّذینَ آمنوا اشدّ حبّ اللہ۔ مومن جذبۂ عشق کے ساتھ ساتھ حق تعالیٰ سے خوف و امید دونوں ہی رکھتا ہے[۲]۔

مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے
ترے نفس میں نہیں گرمئ "یوم النشور"

(غزل[۳])

---

[۱] ضرب کلیم صـ۵۱۰ [۲] متاعِ اقبال۔ [۳] ضرب کلیم صـ۵۱۳

هوالذی جعل لکم الارض ذلولاً فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقہ والیہ النشور ٥ (سورہ ملک آیت نمبر ۱۵)

" وہ خدا جس نے تمھارے لیے زمین کو پست و مطیع کیا تاکہ تم اس کی راہوں میں چلتے پھرتے رہو اور خدا کی روزیاں کھاؤ پیو، اسی کی طرف تمھیں جی کر اُٹھ کھڑا ہونا ہے۔"

اقبالؔ نے مندرجہ بالا آیت شریفہ سے "یوم النشور" کی ترکیب وضع کی ہے۔ "یوم النشور" یعنی آخرت۔ مسلمان کے لیے شرط ہے کہ وہ آخرت پر یقین رکھے اور آخرت پر یقین رکھنے کا مطلب ہے اگر اعتقاد درست نہ ہوئے اور اعمال بد کرتا رہا تو انجام بھی اس کا بد ہوگا اور اگر اعمال اچھے رہے تو انجام بھی اچھا ہوگا۔ مسلمان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ایک دن اسی کی طرف لَوٹ کر جانا ہے۔ یہ سب معلوم ہونے کے باوجود عمل صالح کا نہ اپنانا اس بات کی علامت ہے کہ نفس میں "یوم النشور" کی گرمی نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ آخرت پر پورا یقین نہیں ہے اس لیے اقبالؔ نے انھیں مصلحتاً مُسلمان کہا ہے۔

(۱) بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
تِرے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے

(نکتۂ توحید[۱])

(۲) بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

اِلٰھکم الہٗ وَاحِدٌ لآ الٰہ اِلاّ ھوالرحمٰن الرحیم ٥ (آیت ۱۶۳ سورہ بقرہ)۔

" تم سب کا معبود ایک اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں وہ بہت بڑا بخشش کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔"

اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید، نجات کی سب سے بڑی شرط ہے اور گناہوں میں سب سے عظیم گناہ شرک ہے یعنی خدا کی ذات یا صفات میں خدا کا ساجھی ٹھہرانا۔ اسلام کے ماننے والے خالص اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور اسی کو اپنا خالق، مالک، رازق

---

[۱] ضربِ کلیم ص۵۱۵

غرض سب کچھ جانتے ہیں مگر جن کے دلوں میں ایمان پیوست نہیں ہوا وہ بھلا ایک خدا سے کیسے راضی ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی کسی کے آگے گھٹنے ٹیکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ سورہ زمر آیت نمبر ۴۵ میں ہے۔

واذا ذکر اللہ وحدہ اشمأزت قلوب الذین لا یؤمنون بالآخرۃ واذا ذکر الذین من دونہ اذا ھم یستبشرون ۵ سورہ زمر آیت ۴۵۔

"جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کھل اُٹھتے ہیں"۔

دوسروں کے ذکر پر دل کا کھل اُٹھنا ہی دراصل دماغی بُت خانہ ہے۔

آہ اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرف لا تدع مع اللہ الٰھاً آخر
(لاہور و کراچی)[1]

سورہ شعراء آیت نمبر ۲۱۳ میں ہے۔

فلا تدع مع اللہ الٰھاً آخر فتکون من المعذبین ۵

"تم خدا کے ساتھ کسی اور معبود کی عبادت مت کرنا کبھی تم کو سزا ہونے لگے"۔

سورہ قصص آیت نمبر ۸۸ میں ہے۔

ولا تدع مع اللہ الٰھاً آخر لا الٰہ الا ھو۔

"اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو اس کے سوا کوئی معبود نہیں"۔

دُکھ ہو یا سُکھ، رنج ہو یا غم، خوشی کی محفلیں ہوں یا کوئی اور موقع بہر حال ہمیں صرف اللہ ہی کو پکارنا چاہیئے۔ خدا کو ایک ماننا۔ خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ ٹھہرانا قرآن حکیم کی بنیادی دعوت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو شرک سے

---

[1] ضربِ کلیم ص۱۸

پاک رکھیں۔ توحید پر مضبوطی سے قائم رہیں۔ اقبالؔ نے قرآن حکیم سے براہِ راست استفادہ کیا ہے۔ قرآن حکیم کی اس نصیحت کو شعر کے ذریعے پیش کیا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان!
(مردِ مسلمان)[1]

سورہ رحمٰن آیت ۲۹ میں ہے۔

کُلَّ یومٍ ھو فی شان ٥ "وہ ہر دن نئی شان میں ہے۔"

"اس کی شان یہ ہے کہ ہر پکارنے والے کو جواب دے، مانگنے والے کو عطا فرمائے۔ تنگ حالوں کو کشادگی دے۔ مصیبت و آفات والوں کو رہائی بخشے۔ بیماروں کو تندرستی عنایت فرمائے۔ قیدیوں کو وہ رہائی دیتا ہے[2]۔" اور یہی شان مومن کی ہونا چاہیے۔ چنانچہ قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے۔

کذلک یبین اللہ لکم الآیات لعلکم تعقلون ٥

"اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنے احکامات بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ۔" مومن کی بھی یہی شان ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی باتیں مبہم نہ کرے۔ قول و فعل میں مطابقت ضروری ہے۔ مومن کو اللہ کی برہان کہا ہے۔ برہان کے معنی ہیں دلیل قطعی، اگر مومن ہے تو قول و عمل میں ہم آہنگی کی بناء پر ساری کائنات کے لیے اللہ کی طرف سے دلیل قطعی ہے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
(ضربِ کلیم)[3]

---

[1] ضربِ کلیم ص ۵۲۲

[2] تفسیر ابن کثیر ص ۵۳ جلد پنجم۔ [3] ص ۵۲۲

والذین معہٗ اشداء علی الکفار رحماء بینھم ۔ سورہ فتح آیت ۲۹۔
" اور جو لوگ ان کے ساتھی ہیں وہ کافروں پر بہت سخت ہیں اور آپس میں رحیم ہیں"۔
والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس ۔ سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۳۴۔
" اور غصّہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے ہیں"

قرآن کریم میں جگہ جگہ اور خصوصاً ان دونوں آیتوں میں مومن کے صفات بیان کیے گیے ہیں جنھیں اقبالؔ نے قہاری، غفاری، قدوسی و جبروت کا نام دیا ہے۔ آپس میں رحیم ہونا غفاری اور قدوسی ہے، کفار پر سخت ہونا قہاری و جبروت ہے۔[1]

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
(امرِ مسلماںؒ)

دنیا و آخرت دونوں جہاں میں عدل و انصاف کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ قیامت میں عدل کے متعلق بیان فرمایا کہ "ہم قیامت کے روز میزان قائم کریں گے"[2]۔ دنیا میں کیا گیا کوئی عمل بھی اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں اس لیے اللہ تعالیٰ سے بھول چوک کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دنیا میں عمل کا محاسبہ انتہائی ضروری ہے۔ سورہ رحمٰن آیت ۷تا۹ میں ہے۔

والسماء رفعھا و وضع المیزان ہ الا تطغوا فی المیزان واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان۔ " اس نے آسمان کو بلند کیا اور اس نے ترازو رکھی تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو۔ انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول میں کم نہ دو"۔ اسی طرح دوسری جگہ فرمایا " ویلٌ للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون ہ واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون ہ " بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انھیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم

---

[1] ضرب کلیم صـ ۵۲۲ [2] ونضع الموازین القسط۔

دیتے ہیں۔" سورہ المطففین آیت نمبر ۱ تا ۳۔

فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن[1]

(مردِ مسلمان[1])

پارہ ستائیس[27] میں سورہ رحمٰن ہے اور یہ بھی اللہ کا کلام ہے۔ اسی طرح شب و روز بھی اللہ کی نشانیاں ہیں۔ جس طرح سورہ رحمٰن کو عروس القرآن کہا جاتا ہے اور اپنے لازوال آہنگ کی بنا پر یہ سورہ بڑے سے بڑے، کافر کو ایمان کے قریب لے آتا ہے بالکل اسی طرح سے شب و روز کا آہنگ و نغمہ غور و فکر کرنے والوں کے لیے ایمان کی بشارت ہے۔

تقدیر کا پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند!

(احکامِ الٰہی[2])

سورہ روم آیت نمبر ۲۶ میں ہے۔
وللہ من فی السّموات والارض کلٌّ لّہٗ قانتون ۝ " اور جتنے آسمان و زمین میں موجود ہیں سب اسی کے ہیں سب اسی کے تابع ہیں۔"

نباتات و جمادات یقیناً اللہ کے حکم کی پابندی میں مصروف ہیں۔ قرآن کریم کی دوسری آیت ہے اعطیٰ کلّ شیئٍ خلقہٗ ثمّ ھدیٰ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کو ہدایت دی۔ وہ ہدایت یہی ہے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگی ہوئی اپنی مفوضہ ڈیوٹی کو پورا کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اپنی ضروریات زندگی کے متعلق بھی اس کو ہدایت دے دی ہے کہ بڑے بڑے عقلا کی عقل حیران رہ جاتی ہے۔

---

[1] ضرب کلیم مردِ مسلمان ص ۵۲۲ [2] ضرب کلیم ص ۵۲۶

اور یہی دراصل ان کی تقدیر ہے۔

مومن یقیناً اللہ کے احکام کا پابند ہوتا ہے بلکہ مومن کے لیے حکم ہے کہ وہ کہے میری نماز میری قربانی میرا جینا، میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔" اس کے علاوہ بہت ساری آیتیں ہیں جن میں مومن کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ وہ "سمعنا واطعنا"[1] والے ہیں۔ مگر ان سب کے باوجود مومن مقدر کا پابند ہے۔ ہر شخص نبی نہیں ہو سکتا۔ ہر نبی اللہ سے گفتگو نہیں کر سکتا۔ مومن اپنے مرنے جینے میں مقدرات کا ہی پابند ہے یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جس میں بہرحال مقدرات اہم ہیں، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تقدیر ایمان کا جزو ہے۔ تقدیر و تدبیر کا مباحثہ انتہائی قدیم ہے جو یہاں بے سود ہے۔

نباتات و جمادات بھی احکام الٰہی کے پابند ہیں مگر ان کے مقدرات اٹل ہیں انھیں ارادہ و اختیار حاصل نہیں۔ مومن کے سامنے احکامات الٰہی ہیں وہ ایسے ارادے و اختیارات کی بناء پر احکام الٰہی کی پابندی کرتا ہے۔

فروغ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحب مازاغ
(غزل[2])

آیت نمبر ۱۷ سورہ نجم میں ہے۔
مازاغ البصر وما طغیٰ "نہ تو نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی۔"
یہ قاعدہ ہے کہ مناظر کی فراوانی اور بوقلمونی کی وجہ سے بعض اوقات انسان کی بینائی پوری طرح کام نہیں دیتی چنانچہ حضور اکرمؐ کے شمائل کے باب میں مرقوم ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ باوجود حضورؐ کی صحبت میسر ہونے کے حضورؐ کا صحیح حلیہ بیان کرنے سے اس لیے قاصر تھے کہ اس جلوۂ جہاں تاب کے سامنے نظر اٹھانے کی تاب اپنے اندر نہ پاتے تھے لیکن حضورؐ کا

---

[1] "سن لی ہم نے اور مان لیا ہم نے۔" [2] ضرب کلیم ص ۵۴۷۔

معاملہ اس کے برعکس تھا۔ جب واقعہ معراج پیش آیا تو خدا نے اپنی قدرت کے مختلف مناظر آپ کو دکھائے وہ مناظر ایسے تھے کہ کوئی معمولی انسان ان کے جلوے کی تاب نہ لاسکتا تھا اور حضرت موسیٰ؈ نے جب طور پر نورِ خداوندی کی تھوڑی سی جھلک دیکھی تو بے ہوش ہوکر گر پڑے۔ حضورؐ کا مرتبہ جس قدر بلند ہے اسی قدر آپ کا حوصلہ بھی وسیع ہے یہی وجہ ہے کہ قدرت حق کے غیر معمولی مناظر و انوار دیکھ کر گھبرائے نہیں۔ دماغی توازن کو کھویا نہیں جو کچھ دیکھا وہ بہ حالت ہوش و حواس دیکھا۔

ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب و تمدن کی چمک دمک کے آگے اسی صاحب مازاغ (رسول اکرمؐ) کی تعلیم و ہدایت کی ضرورت ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ آنکھ اس کی صوری خوش نمائی پر فریفتہ ہوکر اس کے باطنی نقوش کو نہ دیکھ سکے اور گمراہی میں مبتلا ہو جائے"۔[1]

"تشکیل جدید الہیات" میں ڈاکٹر اقبال خود اس طرح لکھتے ہیں۔ "قرآن مجید کے نزدیک انسان کی انتہائی مسرت اور سعادت یہ نہیں کہ وہ اپنی متناہیت سے محروم ہو جائے اس کے "اجر غیر ممنون" کا مطلب ہے اس کے ضبط نفس، اس کی یکتائی اور بہ حیثیت ایک خودی اس کی فعالیت کا زیادہ سے زیادہ شدت اختیار کرتے جانا حتیٰ کہ عالمگیر تباہی کا وہ منظر بھی جس سے قیامت کی ابتدا ہوگی۔ اس قسم کی تربیت یافتہ خودی کے سکون و اطمینان پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوگا۔ وَنُفِخَ فِی الصّور فصعق من فی السّمٰوات ومن فی الارضِ اِلّا من شاء اللّٰہ (۳۹ : ۶۹)۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے استثنا کا اطلاق بھی انھیں شخصیتوں پر ہو سکتا ہے جن میں خودی کی شدت انتہا کو پہنچ گئی ہو لہٰذا اس کی نشوونما کا معراج کمال یہ ہے کہ ہم اس خودی سے براہ راست اتصال میں بھی جو سب پر محیط ہے اپنے آپ کو قائم اور برقرار رکھ سکیں جیسا کہ قرآن پاک نے حضور سرور کائناتؐ کے مشاہدۂ ذات کے بارے میں ارشاد فرمایا:۔

مازاغ البصر وما طغیٰ (۵۳ : ۱۷)۔

---

[1] متاعِ اقبال"۔

یہ ہے اسلام کے نزدیک انسانیت کامل کا تصوّر جس کا اظہار فارسی کے اس شعر سے بڑھ کر حضور رسالت مآبؐ کے واقعہ معراج کے بارے میں کہا گیا ہے اور کہیں نہیں ہے ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی[1]

ساری تفصیلات درج کرنے کے بعد راقم الحروف کو بے اختیار ایک آیت یاد آتی ہے۔ وکذلك جعلنٰکم اُمّۃً وّسطاً۔ (آیت ۱۴۲ سورہ بقرہ)۔ " اور اے (متبعان محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنا دی ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے۔ اس آیت میں اُمّت محمدیہؐ کی ایک امتیازی فضیلت و خصوصیت کا ذکر ہے کہ وہ ایک معتدل امّت بنائی گئی۔ ذرا سا غور کیا جائے تو یہ آیت مازاغ البصر والی جہت یعنی توازن و اعتدال کا شاہکار ہے۔ مولانا محمد شفیع صاحب اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

" انسان کا جوہر شرافت اور مدارِ فضیلت اس کے روحانی اور اخلاقی کمالات ہیں اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بدن انسانی کی طرح روحِ انسانی بھی اعتدال و بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے اور جس طرح بدن انسانی کی صحت، اس کے مزاج اور اختلاط کا اعتدال ہے۔ اسی طرح روح کی صحت روح اور اس کے اخلاق کا اعتدال ہے۔ اس لیے انسان کامل کہلانے کا مستحق صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہے۔ یہ کمال تمام انبیاءؑ کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے اور ہمارے رسول کریمؐ کو انبیاءؑ میں بھی سب سے زیادہ کمال حاصل تھا۔ اس لیے انسان کامل کے اوّلین مصداق آپؐ ہی ہیں[2]۔"

---

[1] موسیٰؑ ایک جلوۂ صفات سے ہی بے ہوش ہو گئے مگر تو نے عین ذات کو تبسم کے ساتھ دیکھا
تشکیل جدید الٰہیات صـ ۱۷۷،۸

[2] معارف القرآن جلد اوّل صـ ۳۱۱

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد[1]

(عورت کی حفاظت)

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علیٰ بعض۔

"مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض پر فضیلت عطا کی ہے۔" (سورہ النسا آیت ۳۴)

للرّجال علیھنّ درجة۔ "مردوں کے درجے بڑے ہیں۔"

(سورہ بقرہ آیت ۲۸۸)۔

النساء حرث لکم فاتوحد ثکم انیٰ شئتم۔ (سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۲۳)۔

"عورتیں تمھارے لیے کھیتی ہیں جس طرح چاہو تم اس میں کھیتی کرو۔"

قرآنی آیتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر بہرحال فضیلت حاصل ہے۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی مرد اور عورت دونوں الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم و تسکین کا باعث ہیں۔ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر لازم ہیں[2] جہاں تک نسوانیت زن کی نگہبانی کا معاملہ ہے۔ سیدہ رضیہ اپنے مقالے میں لکھتی ہیں:

"یہاں اقبال واضح طور پر اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں زندہ حقیقت یہ ہے کہ عورت کو حفاظت کی ضرورت ہے اور اس کی نسوانیت کی حفاظت صرف مرد کر سکتا ہے۔ آج کے دور میں شاید یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہو لیکن بیسویں صدی کے ابتدائی چالیس برسوں میں مغرب سے جو خوش اندام لیڈیاں آتی تھیں اور جو ہندوستانی

---

[1] ضرب کلیم ص ۵۵۸

[2] لھن مثل الذی علیھن بالمعروف۔ عورتوں کے حقوق مردوں کے ذمے ایسے ہی واجب ہیں جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر۔

خواتین ان لیڈیوں کے نقشِ قدم پر چلتی تھیں وہ اپنی نسوانیت کا محافظ اپنے پالتو کتوں کو سمجھتی تھیں۔ یہ کتے اتنے نازونعم سے اور رکھ رکھاؤ سے پالے جاتے تھے کہ آدمی ان کے آگے ایک حقیر پسّو معلوم ہوتا تھا اور کتوں میں بھی تخصیص تھی۔ دیسی کتے .. ... ان کا کام آوارگی، کھمبوں پر پیشاب کرنا، ہر وقت چیخنا اور لڑنا اور دعوتوں کے بعد پھینکے گئے کھانوں پر جھپٹنا وغیرہ تھا۔ اس کے برعکس ولایتی کتے آرام سے رہتے تھے۔ تمیز و تہذیب ان کی سرشت میں تھی۔ گودوں میں سوتے تھے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ اقبال کو مجبور ہو کر لکھنا پڑا کہ نسوانیت زن کا نگہبان صرف مرد ہے۔

ایک دوسرا پہلو بھی قابلِ غور ہے۔

(۱) کیا نسوانیت زن کو حفاظت کی ضرورت ہے؟

(۲) مرد کے علاوہ وہ کون ہے جس سے اس کی نسوانیت کو خطرہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس سے نسوانیت کو خطرہ ہے علامہ اس کو محافظ بناتے ہیں یعنی ڈاکو ہی پولیس کا کام کرتا ہے۔ یہ بات منطقی اعتبار سے اقبال کے شایانِ شان نہیں۔

دراصل راقمۃ الحروف کے خیال میں جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو پالیا کہ اس کی عورتیں نہ صرف اپنی حفاظت آپ کرتی ہیں بلکہ میدان جنگ میں اپنے زخمی بھائیوں اور شوہروں کی حفاظت کرتی ہیں اس قوم کے آفتاب کو کبھی گہن نہیں لگ سکتا اور جب عورت ایک بوجھ بن کر مرد کو اپنا قلعہ، عزت کا چوکیدار بنا کر غافل ہو جائے گی تو پھر اس قوم کا سورج ڈوب جائے گا۔[1]"

ان سب باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو کھیتی سے تشبیہہ دی ہے یا استعارہ کیا ہے اور کھیت کو بہر حال ایک نگہبان کی حاجت ہوتی ہے۔ کھیت کی شادابی، جوتنے اور پانی دینے پر منحصر ہے اور اگر نگہبانی نہ ہو تو کھیت بنجر ہو جائے گا۔ اقبال نے بھی اسی آیت سے استفادہ کرتے ہوئے یہ مصرعہ لکھا ہے۔ یہاں اگر کوئی اعتراض ہے تو لفظ "فقط"

---

[1] ص ۱۵۳ ص ۱۵۲ سیدہ رضیہ۔ "اقبال کے کلام میں عورت کا مقام"

سے 'صرف' ہے اور کسی دوسری مخلوق کی نفی کی گئی ہے۔ بیشتر تراجم میں قوّامون کے معنی حاکم کے لکھے ہیں۔ اُستاد محترم اس کے معنی قومی بتاتے ہیں بہرحال دونوں صورتوں میں جہاں مرد اور عورت کے ایک سطح پر رکھا گیا ہے وہیں مرد کو عورت پر فضیلت دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے اقبالؔ نے مرد کو نسوانیت کا نگہبان بتایا ہے۔

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہے نمودار
(اشتراکیت[1])

سورہ بقرہ آیت ۲۱۹ میں ہے۔

یسئلونك ماذا ینفقون ط قُلِ العفو ط " اور تجھ سے یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں تو کہہ دے جو کچھ کہ ضرورت سے زائد ہو"

اسلام میں امیر، غریب، چھوٹے بڑے ہر ایک کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ایک شخص کے پاس تمام اموال جمع نہ ہو جائیں اس لیے قرآن کریم میں جگہ جگہ خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جمع خوری کو انتہائی سخت جرم قرار دیا گیا ہے۔ وہ مال جو نصاب تک پہنچتا ہے اس پر زکوٰۃ کا نکالنا فرض ہے۔ دوسری طرف صدقات، خیرات کی بھی ترغیب دی گئی ہے اس آیت میں یہ کہا گیا جو مال ضرورت سے زائد ہو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

اسلام انسان کے جذبات کی بھی قدر کرتا ہے۔ اسلام نے حق ملکیت کو جائز قرار دے کر دنیا کی رونق میں اضافہ کیا ہے۔ اقبالؔ اشتراکیت کے خلاف ہیں اور مومن کو مال رکھنے کا جو طریقہ بتلایا گیا ہے وہ اس دور کے تمام لوگوں کو بتلاتے ہیں۔

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس[2]

---

[1] ضربِ کلیم ص ۵۹۸ [2] ضربِ کلیم ص ۶۰۵

سورہ ص آیت ۷۶ میں ابلیس کے بارے میں ہے :

خلقتنی مِن نارٍ وَّ خَلَقتَہٗ مِن طین

" مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے (آدم) مٹی سے"۔

جب آدمؑ کو سجدہ کرنے کے لیے حکم ہوا تو ابلیس نے انکار کر دیا اس وقت یقیناً ایک ہی ابلیس تھا ، مگر ابلیس نے اللہ رب العزت سے تا قیامت لوگوں کو سیدھے راستے سے بھٹکانے ، برائی کی طرف راغب کرنے کی مہلت مانگی جو اسے مل گئی۔ ہر وہ شخص جو ابلیس کے حکم کی پیروی کرتا ہے اس کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتا ہے اسے ابلیس جیسا کہا گیا۔ چنانچہ فضول خرچی کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے۔ اِنَّ المبذّرین کانوا اخوان الشّیٰطین۔ "بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں[۱]"۔ اسی طرح معبودان باطل کو بھی شیطان کہا گیا۔ یہاں اس حدیث کو اگر سامنے رکھیں تو بات اور واضح ہو جاتی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ شیطان صرف وہ نہیں جسے تم نہیں دیکھتے بلکہ وہ بھی شیطان ہی ہیں جو برائی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر!

(غلاموں کے لیے[۲])

ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولئک حبطت اعمالھم فی الدّنیا والاٰخرۃ۔ (سورہ بقرہ آیت ۲۱۷)۔ "اور جو شخص تم میں سے اپنے دین (اسلام) سے پھر جائے پھر کافر ہونے کی حالت میں مر جائے تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں"۔

عمل کی مقبولیت کا دارومدار عقائد پر ہے اگر عقائد درست رہے تو یقیناً ان کے

---

[۱] آیت ۲۷ سورہ بنی اسرائیل [۲] ضرب کلیم ص ۶۰۶

اعمال کا وزن ہوگا ورنہ "اولئک حبطت اعمالھم" والا معاملہ ہوگا۔ عقائد کی پختگی ہی سے عمل میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ عمل زار و زبوں ہونے کی وجہ انسان کا عقائد سے تہی ہونا ہے۔ اقبال کا نظریہ بھی یہی ہے۔

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہٗ

(محراب گل افغاں کے افکار[1])

سورہ انعام آیت نمبر ۱۶۲، ۱۶۳

قُل اِنّ صلاتی ونُسکی ومحیای ومماتی لِلّٰہ ربّ العالمین ٥ لاشریک لہٗ و بذلک امرت وانا اوّل المُسلمین ٥

اس آیت شریفہ سے صرف لفظ کا استفادہ کیا گیا ہے لاشریک لہٗ "اس کا کوئی شریک نہیں" سے توحید کی دعوت ہے قرآن کریم میں ہے ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم وان یخذلکم فمن ذالذی ینصرکم من بعدہٖ "اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ آسکے گا اور اگر مدد نہ کرے تو پھر ایسا کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے اس کے بعد" (آل عمران آیت ۱۶۰)۔ دوسری جگہ ہے انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ "تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو"۔ (آل عمران آیت نمبر ۱۳۹) مومن کے ایمان کا دارومدار توحید پر ہے۔ توحید کا عقیدہ جس قدر پختہ ہوگا اسی قدر مضبوطی و سربلندی ملے گی[2]۔

افغان باقی، کہسار باقی
الحکم للّٰہ، الملک للّٰہ!

(محراب گل افغان[3] کے افکار)

---

[1] ضرب کلیم ص ۶۲۷

[2] توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے۔ [3] ضرب کلیم ص ۶۲۸

سورہ انعام آیت ۵۷۔
انِ الحکم الاّ للّٰہ ۔ "حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے"۔
سورہ انعام ہی میں آیت ۷۳ میں ہے۔
قولہُ الحق ولہ الملک ۔ "اسی کا کہنا باحق ہے اور حکومت خاص اسی کی ہے"۔
سورہ ملک آیت نمبر ۱۔
تبٰرک الذی بیدہ الملک ۔ "بہت ہی بابرکت وہ خدا ہے جس کے ہاتھ میں بادشاہت (ملک) ہے"۔

"محراب گل افغان کا افکار" کے تحت ضرب کلیم میں جو اشعار ملتے ہیں وہ سب امان اللہ خاں کے بعد "بچہ سقہ" کی حکومت اور اس کے بعد نادر خاں کی بغاوت اور استقرار پھر استقرار حکومت کا ردّ عمل ہے۔ اقبال نادر خاں سے بیحد متاثر تھے۔ ان کو امیرالمومنین بھی لکھا ہے اور انھیں کی وجہ سے مندرجہ بالا شعر کہے ہیں۔ یورپ کی تمام تر سازشوں کے باوجود اللہ کا حکم بھی تھا اور ملک بھی اللہ کا تھا جس کو چاہا دیا۔

لا دینی و لاطینی! کس پیچ میں اُلجھا تو!
دارو ہے ضعیفوں کا لا غالب الاّھو
(محراب گل افغان کے افکار[۱])

سورہ یوسف آیت ۲۱ میں ہے۔
واللّٰہ غالب علیٰ امرہٖ "اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے" سورہ مجادلہ آیت ۲۱ میں ہے۔
کتب اللّٰہ لاغلبن انا و رُسلی ٥
"اور اللہ لکھ چکا ہے کہ ضرور میں غالب آؤں گا اور میرے رسول بھی"۔

۱۔ ضربِ کلیم ص۶۳۴

جب اللہ ہی سب پر غالب ہے تو اس کو چھوڑ کر دوسرا راستہ کہاں صحیح ہو سکتا ہے۔" اس کے پس منظر میں سارے مباحث ہیں جو سیکولرزم کی غلط توجیہہ کرتے ہیں اور تاریخی طور پر افغانستان میں امان اللہ خاں کی تجدد پسندی اور ترکی میں اتا ترک کا لاطینی حروف کا استعمال شامل ہے۔

یہ عناصر کا پرانا کھیل، یہ دنیائے دوں!
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں
(ابلیس کی مجلس شوریٰ)[1]

قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفك الدماء و نحن نسبح بحمدك و نقدس لك ۝ (سورہ بقرہ آیت ۳۰)

"فرشتوں نے کہا! کیا تو زمین میں ایسی ہستی کو خلیفہ بنائے گا جو خرابی پھیلائے گی اور خونریزی کرے گی حالانکہ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہوئے تیری پاکی کا اقرار کرتے ہیں۔"

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو بنانا چاہا تو فرشتوں نے استعجاباً سوال کیا تھا کہ ہم تیری تسبیح و تحمید کے لیے کافی ہیں پھر آدم کو بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس میں جو مصلحت ہے وہ تم نہیں جانتے۔ اقبال نے اپنی اس نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیس کی اہمیت بتلائی ہے اور اس شعر میں ابلیس کا قول ہے کہ یہ وہی دنیا ہے جو ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کے خلاف بنائی گئی گویا ان کی تمناؤں کا خون ہو کر یہ دنیا آباد ہوئی۔

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں
(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ)[2]

---

[1] ابلیس کی مجلس شوریٰ ص ۶۴۷ ارمغانِ حجاز۔ [2] ارمغانِ حجاز ص ۶۴۷

کھیٰعص ۝ سورہ مریم آیت نمبر ۱۔

نٓ ۝ سورہ القلم آیت نمبر ۱۔

قرآن حکیم میں کاف و نون (حروف مقطعات) کا علم سوائے ذات باری کے کسی کو نہیں ہو سکتا یا جس کسی کو اللہ تعالیٰ یہ علم بخش دے۔

اقبالؔ نے اس مصرعے کو ابلیس کی زبان سے ادا کیا ہے۔ ابلیس یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس کائنات کی کنہ ہو حقیقت سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ دونوں حروف دو مختلف سورتوں کے پہلے حروف ہیں جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

(بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو)[1]

دین کو چھوڑ کر دنیا میں زندگی بسر کرنا خسارا ہی خسارا ہے چنانچہ قرآن پاک نے اعلان کیا۔ والعصر ۝ ان الانسان لفی خسر ۝ الا الذین آمنوا و عملوا الصّٰلحٰت۔ "تمام لوگ خسارے میں ہیں سوائے ان کے جو ایمان والے ہیں اور جو عمل صالح کرنے والے ہیں۔" اسی طرح سورہ مائدہ آیت ۴۴ میں فرمایا "لا تشتروا بآیٰتی ثمناً قلیلاً ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکٰفرون ۔ "اللہ کی آیتوں کو قیمتوں میں مت بیچو جو کچھ کہ اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اس وحی کے ذریعے فیصلہ نہ کریں وہی مکمل کافر ہیں۔" سورہ بقرہ آیت ۱۶ میں ہے اولٰئک الذین اشتروا الضلٰلۃ بالھدیٰ فما ربحت تجارتھم وما کانوا مھتدین ۝ "وہی ہیں جنھوں نے خرید کی گمراہی ہدایت کے بدلے میں تو نفع نہ لائی ان کی تجارت اور نہ ہی وہ ہدایت پا سکے۔"

ہدایت کے بدلے میں گمراہی خریدنا ایسی تجارت میں سوائے خسارہ کے کچھ نہیں۔

---

[1] ارمغانِ حجاز صـ ۶۵۸

اسی مضمون کو اقبالؔ نے بیان کیا ہے

خبر، عقل و خرد کی ناتوانی
نظر، دل کی حیاتِ جاودانی
(تصویر[1])

ناقص علم اور فلسفہ محض ناتوانی ہے کیونکہ یقین سے دور ہے۔

انّ الظنّ لا یغنی عن الحق شیئاً سورہ نجم آیت ۲۸۔

"بے شک ظن و تخمین حقیقت کی تلاش میں کچھ کام نہیں دیتے۔"

شیاطین ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!
(ارمغانِ حجاز)

علامہ اقبالؔ لکھتے ہیں :۔ غلام قوم مادیات کو روحانیت پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔

سورہ عنکبوت آیت ۳۸ میں ہے وزیّن لھم الشیطٰن اعمالھم "اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے نظر میں مستحسن کر دیا۔[2]"

یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ تجارت
جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد!
(دوزخی کی مناجات[3])

---

[1] ارمغان حجاز صـ ۶۶۰ [2] اقبال اور قرآن صـ ۱۰۲۴۔
[3] صـ ۶۶۵

تن پروری اور سرمایہ داری کے لیے آج کل کے علم و حکمت اور سیاست و تجارت کو استعمال کیا جارہا ہے۔

سورہ عنکبوت آیت نمبر ۳۸ میں ہے۔

وزیّن لھُم الشیطانُ اعمالھم فصدھم عن السّبیل ٥

"اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظر میں مستحسن کر دیا اور ان کی راہ سے روک دیا۔"[۱]

اقبالؔ مغرب کے علم کو شیطانی اعمال قرار دیتے ہیں۔ "لینن خدا کے حضور میں"۔ کہتے ہیں ٥

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

رہے تری خدائی داغ سے پاک
مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر!

(رباعیات[۲])

سورہ الماعون آیت ۴ تا ۶۔

فویلٌ لِلمصلّین الّذی ھُم عن صلاتھم ساھون ٥ الّذین ھُم یرآءون ٥

"ان نمازیوں کے لیے افسوس اور "ویل" نامی جہنم کی جگہ ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں جو ریاکار ہیں۔"

"عن صلاتھم" یہ لفظ شامل ہے ایسے نمازی کو بھی جو ہمیشہ نماز کو آخری وقت میں ادا کرتے ہیں یا عموماً آخری وقت پڑھے یا ارکان و شرائط کی پوری رعایت نہ

---

[۱] اقبال اور قرآن صد ۱۰۱۹

[۲] ارمغان حجاز صد ۶۷۲

کرے یا خشوع وخضوع اور تدبر و غور و فکر نہ کرے لفظ قرآن ان میں سے ہر ایک کو شامل ہے۔"[1]

ریاکاری کے لیے اقبال نے بے ذوق سجدہ کی ترکیب وضع کی ہے۔

کچھ آیتیں اقبال نے "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں درج کی ہیں ان آیات کے بارے میں پروفیسر مجاور حسین رضوی صاحب کا کہنا ہے کہ اقبال کے اردو شعری سرمائے میں یہ آیات براہِ راست نظم نہیں کی گئی ہیں بلکہ اقبال کے ذہنی اُفق کی تشکیل اور ان کے شعور کی تکمیل اور ان کی شعری تخلیقات کی تنزیل میں یہ آیات حسن پردہ دار اور نور حجاب کا کام کرتی ہیں مثلاً سورہ فصلت آیت ۵۳ سنریھم آیتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہٗ الحق اولم یکف بربک انہٗ علیٰ کل شیئٍ شھید[2] ٥ جیسے ہی ہم اس آیت کی تلاوت کرتے ہیں بے اختیار "لیکن خدا کے حضور میں" کا پہلا مصرعہ ذہن میں گونجنے لگتا ہے ؎

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات

اسی طرح سورہ انعام آیت ۱۶۲ میں ہے: ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین یعنی "بے شک میری نماز میری قربانی میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہاں کا رب ہے۔" اس کے معنی ہوئے رضائے الٰہی کا حصول اور یہی رضائے الٰہی کا حصول فلسفۂ خودی کی بنیاد ہے اسی طرح اس آیت شریفہ میں ہے میری نماز، میری قربانی سب اللہ کے لیے ہے"۔ جب بھی ان کا یہ شعر پڑھا جاتا ہے ؎ نماز، روزہ و قربانی و حج   یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد پنجم صفحہ ۱۱ پ ۳۰۔

[2] ترجمہ "عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذاتوں میں بھی یہاں تک کہ ان پر حق کھل جائے کہ حق یہی ہے کیا تیرے رب کا ہر چیز سے واقف و آگاہ ہونا کافی نہیں۔"

توصاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے ذہنی پس منظر میں یہ آیت موجود ہے، نماز، روزہ و قربانی بطور رسم ادا ہو رہے ہیں اللہ کے لیے نہیں۔ اسی طرح سورہ توبہ کی آیت نمبر ۱۱۱ میں انّ اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بانّ لھم الجنۃ۔ یہاں بھی جان و مال کی خریداری اور عوض میں جنّت (اقبالؔ کے یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنّت سے مراد اللہ کی رضا ہے) کوئی مکانی تصوّر نہیں ہے اور یہ درست بھی ہے اس لیے کہ اگر اس کی رضا نہیں تو جنّت نہیں اور اگر اس کی رضا حاصل ہے تو بقول اقبالؔ ع

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

احادیث

حدیث فرمودات سرکار رسالت ہے اور گذشتہ چودہ سو برس میں اس علم نے مستقل بالذات حیثیت حاصل کرلی ہے۔ دنیا کا کوئی علم ایسا نہیں ہے جو خود اپنی ذات سے تمام علوم پر اس طرح حاوی ہو جس طرح حدیث۔ اس لیے کہ طریقۂ کار کے اعتبار سے علم حدیث سے باخبری ذوق تحقیق سے آشنا کرتی ہے۔ حدیث حرام وحلال کی بحث، معاشیات، معاشرت اور معاد کے سارے مسئلے اپنے دامن میں سمولیتی ہے۔ اس سے قطع نظر عمرانیات، تاریخ، سیر اور علم رجال حدیث ہی کی دین ہے۔

حدیث کی چھ کتابیں مشہور ہیں جنھیں صحاح ستہ کہتے ہیں وہ یہ ہیں: بخاری، نسائی ابوداؤد، مسلم، ابن ماجہ، ترمذی۔ یہ تمام احادیث ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور انھیں لاکھوں میں سے منتخب کیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے احادیث جمع کیں انھوں نے بھی اس ذمہ داری سے اس بات کا اعلان کردیا ہے کہ احادیث کی چھان بین قاری کا کام ہے اور ایک بنیادی اصول یہ بتا دیا گیا کہ اگر حدیث قرآن حکیم سے معارض ہو تو اسے دیوار پر پھینک مارو۔ اس لیے حدیث کا معاملہ بہت ہی نازک ہے بلکہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اس لیے اقبال کے کلام میں قرآنی آیات تو ہیں مگر اس تناسب سے احادیث کم ہیں اس لیے کہ اقبال کے سامنے یہ مسئلہ بھی رہا ہوگا کہ حدیث موضوع ہے یا مرفوع یا راوی ضعیف ہے یا استناد کمزور ہے وغیرہ۔

اقبال نے اردو کلام میں چند حدیثوں سے استفادہ کیا ہے۔ چوں کہ ہمارا موضوع

فارسی کلام نہیں ہے اس لیے ان سے صرف نظر کیا جا رہا ہے اور اُردو میں صرف وہ حدیثیں لی گئی ہیں جو واضح طور پر بطور حدیث استعمال ہوئی ہیں۔

حدیثوں کا یہ جائزہ دراصل قرآنی آیات کے ضمیمے کی حیثیت رکھتا ہے دراصل اقبالؔ نے جو کچھ کہا وہ حدیث کی اعانت سے قرآن کی روشنی میں کہا ہے۔ اس طرح یہ جائزہ قرآن و حدیث دونوں کا تعارف ہے۔ کوشش اس بات کی کی گئی ہے کہ احادیث میں ایجاز و اختصار سے کام لیا جائے۔ بعض شارحین نے کوشش کی ہے کہ اقبالؔ کے کلام میں اشعار کا سَر چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، آیات و احادیث کا تاج اس کے سَر پر رکھ دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی کتاب "اقبال اور قرآن (ہزار صفحات سے زیادہ) تقریباً ہر شعر کو کسی نہ کسی آیت کی روشنی میں قرار دیا چاہے ربط ہو یا نہ ہو۔

حدیث کے ضمن میں "متاعِ اقبال" میں (جس کا تعارف اور تبصرہ جناب وقار عظیم اور محمد جعفر پھلواری نے لکھا ہے اسی طرح کی صورتِ حال ہے) البتہ فضلِ الٰہی عارف صاحب نے خواہ مخواہ احادیث کو محور فکر نہیں بنایا انھوں نے اُردو کلام میں صرف تین حدیثوں کا ذکر کیا ہے۔ راقم الحروف نے اس میں دو چار کا اضافہ کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ الفقر فخری اور اسی قبیل کے حدیثوں کو چھوڑ کر کلامِ اقبال میں حدیثوں سے استفادے کی کم مثالیں ہیں۔

پھڑک اٹھا کوئی تری ادائے ماعرفنا' پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں[۱]

مَاعَرَفنَاکَ حقّ معرفتک (حدیث)

"اے خدا ہم نے تجھے اس طرح نہیں پہچانا جو تجھے پہچاننے کا حق ہے۔"

"خدا کے خاص بندے کبھی اپنے زہد و اطاعت پر اتراتے نہیں بلکہ ہمیشہ اپنے

---

[۱] بانگِ درا ص ۱۰۵۔

عجز و درماندگی کا اعتراف کرتے ہیں۔ رسول اکرم صلعم سے بڑھ کر کون خداشناس ہو سکتا ہے۔ لیکن حضورؐ بھی عرفان کا حق ادا کرنے کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ اس باب میں کوتاہی کا اعتراف کرتے ہیں[۱]۔"

اس سلسلے میں یہ عرض کرنا بہت ضروری ہے کہ یہ حدیث بہت معروف ہے۔ میر امّن نے "باغ و بہار" میں اس حدیث کو لکھا ہے۔ رشید حسن خاں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث نہیں بلکہ قول ہے[۲]۔"

۱؎ متاعِ اقبال ص۳۴۰

۲؎ رشید حسن خاں کا تبصرہ یہ ہے۔ "پہلے مصرع میں "میں نے پہچانا نہیں" سے واضح طور پر مراد ہے اس مشہور قول سے ماعرفناک حق معرفتک، میر امّن نے اس قول کو قول پیمبر یعنی حدیث بتایا ہے مرزا رجب علی بیگ سرور نے بھی دیباچۂ فسانۂ عجائب میں حمد ذیل حمد اس قول کو حدیث لکھا ہے۔ "جس کی شان میں مخبر صادق یہ فرمائے۔ دوسرا اس عہد سے کب برآئے: ماعرفناک حق معرفتک") شیخ سعدیؒ نے گلستاں کے دیباچے میں لکھا ہے۔ "عاکفانِ کعبہ جلالش بہ تقصیر عبادت معترف کہ ماعبدناک حق عبادتک واصفان حلیۂ جمالش بہ تحیر منسوب کہ ماعرفناک حق معرفتک) (گلستاں بہ تصحیح عبدالعظیم گرگانی طبع تہران) سعدیؒ نے جس طرح اقوال کو لکھا ہے اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول پیمبر یعنی حدیث نہیں اور یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ میں کوشش کے باوجود یہ معلوم نہیں کر سکا کہ یہ کس کا قول ہے؟ بہ ظاہر یہ کسی صوفی کی کہی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی اُستاد شعبۂ اردو (بنارس یونی ورسٹی) نے میرے خط کے جواب میں لکھا تھا۔

" ماعرفناک حق معرفتک کے سلسلے میں آپ کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے لیکن یہ کس کا قول ہے؟ اس کی تحقیق کی میں نے ضرور کوشش کی لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ میں کسی قدر اس کی تفصیل عرض کیے دیتا ہوں۔ جلال الدین سیوطی نے الجامع الصغیر میں حروف تہجی کی ترتیب سے مشہور احادیث و آثار کے ابتدائی ٹکڑے نقل کرتے ہوئے ان کے ماخذ کی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب میں یہ قول مذکور نہیں۔ شمس الدین سخاویؒ نے "المقاصد الحسنہ" میں مشہور اقوال و آثار جمع کیے ہیں اور پھر ان کے حدیث،

(باقی صــــ پر)

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
"بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا"
(خطاب بہ جوانانِ اسلام)[1]

الفقر فخری : "فخر میرے لیے باعثِ فخر ہے۔" (حدیث)

"رسول اکرم صلعم فقر کو سرمایۂ فخر سمجھتے تھے چنانچہ اوپر کی حدیث کے علاوہ حضور[2] کی اس دعا کے الفاظ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ "اے خدا مجھے مسکینی میں زندہ رکھ مسکینی میں دنیا سے اٹھا اور مسکینوں کے زمرے میں مرا حشر ہو۔"

(بقیہ حاشیہ) اثر یا قول ہونے کی تحقیق کی ہے اس میں بھی ماعرفناک الخ کا ذکر نہیں۔

ملا علی قاری نے تذکرۃ الموضوعات میں ان تمام اقوال کو بڑی حد تک جمع کر دیا ہے جن کے بارے میں حدیث ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے حالانکہ وہ حدیث نہیں ہیں۔ لیکن زیر بحث قول ان کے یہاں بھی موجود نہیں البتہ ایک دوسرا مشہور قول من عرف نفسہ فقد عرف ربہٗ معہ موجود ہے اور اس کے بارے میں یہ تصریح کی ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے ....

قرآن پاک کی ایک آیت وما قدروا اللہ حق قدرہٖ (سورہ زمر)۔ یہ خیال آیا کہ ممکن ہے اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں کسی مفسر نے متذکرہ بالا قول نقل کیا ہو چنانچہ متقدمین میں حافظ ابن کثیر کی تفسیر "ابن کثیر" اور متاخرین میں علامہ آلوسی کی روح المعانی دیکھ ڈالیں لیکن ان میں بھی پتا نہ چلا۔

جرمن مستشرقین کی ایک جماعت نے احادیث کے دس مشہور مجموعوں کا اشاریہ تیار کیا ہے۔ احتیاطاً اسے بھی دیکھ لیا۔

آئندہ اگر کہیں اس کا سراغ مل گیا تو انشاءاللہ لکھ بھیجوں گا۔"[2]

---

[1] بانگِ درا صـ ۱۸۰۔

[2] باغ وبہار میرامن دہلوی مرتب رشید حسن خاں)

(حاشیہ۔ صفحہ نمبر ۳۹۲، صـ ۳۹۲ سنہ اشاعت ۱۹۹۲)

"رسولِ اکرم صلعم فقر کو سرمایۂ فخر سمجھتے تھے چنانچہ اوپر کی حدیث کے علاوہ حضورؐ کی اس دعا کے الفاظ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ "اے خدا مجھے مسکینی میں دنیا سے اٹھا اور مسکینوں کے زمرے میں میرا حشر ہو۔"

اکثر صحابہ کرامؓ کا بھی یہی حال تھا کہ باوجود دولت و خوش حالی کے فقیرانہ طرزِ زندگی کے خوگر تھے اور فقر پسندی کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم حق کو عموماً غربا ہی قبول کرتے ہیں اور وہی اس کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ امرا، نشۂ دولت میں سرشار رہنے کی وجہ سے خدا کی اطاعت اور زندگی کے مقصد اصلی سے غافل رہتے ہیں دولت اور سامانِ تعیش کی فراوانی انھیں کم مہلت دیتی ہے کہ وہ سب کچھ دینے والے کی شکر گذاری کا بھی کچھ حق ادا کریں[1]۔"

نکل کے باغِ جہاں سے برنگ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

(حضور رسالت مآبؐ میں)[2]

متعدد احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ حضورؐ تحفہ تحائف کا لین دین کرتے تھے اور آپؐ اس عمل کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری کے "کتاب الھبہ" میں حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت انس بن مالکؓ سے تین تین روایتیں ہیں حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایک روایت ہے کہ آپ تحفہ تحائف کا لین دین کرتے تھے[3] چند روایتیں درج کی جاتی ہیں۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں حضورؐ ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس کا بدلہ بھی دیتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا اگر مجھے (بکری وغیرہ کے) دست و پا ہی کھلانے کے لیے بلایا جائے تو میں اس کو بھی قبول کروں گا اور اگر دست و پا مجھے ہدیتہً دیئے جائیں تو لے لوں گا۔

---

[1] متاعِ اقبال ص ۳۴۰، ص ۳۴۱

[2] بانگِ درا ص ۱۹۷ [3] تجریدالبخاری ص ۲۰۳، ص ۲۰۴

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوّت کی جہانگیری، محبّت کی فراوانی !

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی[1]

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا[2]

حجۃ الوداع کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت فصیح و بلیغ و جامع خطبہ دیا۔ اس موقعہ پر آپؐ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ہاں! کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی بڑائی نہیں۔ تم سب ایک آدمؑ کے بیٹے ہو، اور آدمؑ مٹی سے بنا تھا۔"[3]
قرآن حکیم میں بھی ارشاد ہے۔ انّما المومنون اخوۃ فاصلحو بینکم۔ "مومنین آپس

---

[1] بانگ درا ص ۲۷۰
[2] بانگ درا ص ۲۷۳ [3] سیرۃ النبی۔ از شبلی نعمانی۔

ہیں بھائی بھائی ہیں۔ تم ان کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔"

(سورہ حجرات آیت نمبر۱۰)

اقبالؔ کے اشعار میں بھی اخوت کا پیغام ہے جو سرکارؐ کے خطبے سے استفادہ ہے اور سرکار کا خطبہ یقینی طور پر قرآنی آیت کی توضیح ہے۔ اس اعتبار سے اشعار آیت و حدیث دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان تمام اشعار کا مفہوم رنگ و نسل و علاقائیت کے بجائے اخوت ہے۔ اقبالؔ نے ایک جگہ اور کہا ہے ؎

تقسیمِ ملل، حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدمؑ

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک [۱]

لولاک لما خلقت الافلاک (حدیث)

"اگر آپ نہ ہوتے تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا۔"

"یہ ایک حدیث کے الفاظ ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر میں آپ کو پیدا نہ کرتا تو دنیا ہی وجود میں نہ آتی گویا ساری کائنات کو خدا نے حضورؐ کی خاطر پیدا کیا۔ اکثر شعراء حضورؐ کی تعریف میں حرف لولاک سے مزین کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر اقبالؔ نے اس سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ مردِ مومن اگر ایسے رسولؐ سے جس کی شان لولاک ہے اسے اپنے آپ کو وابستہ کرلے اور اسی کا ہو کر رہے تو حضورؐ کی وساطت سے وہ بھی اس دنیا کی تمام میراث کا مالک ہے[۲]۔" چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ؎

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے! [۳]

۱؎ بالِ جبریل ص ۲۵۹ ۲؎ متاعِ اقبال ص ۲۳۹ ۳؎ بالِ جبریل ص ۳۲۶

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں[1]

حضرت علیؓ کے لیے جنگِ خیبر کے موقع پر ارشاد فرمایا "آج عَلم ایسے مرد کو دوں گا جس کے ہاتھ پہ خیبر فتح ہوگا جو کرار اور غیر فرار ہوگا ــــــــ" مرد آزما کا لفظ خیبر کے واقعے کے سلسلے کی اس حدیث سے مستعار ہے۔

حافظ ناموس زن چونکہ اس شعر میں اس لفظ کی ترکیب قرآن سے مستعار ہے اس لیے اس کا ذکر یہاں نہیں کیا جا رہا ہے۔

---

[1] ارمغان حجاز ص۶۵۵

مذہبی اصطلاحات

اقبال نے قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ مذہبی اصطلاحات کا ضرور سہارا لیا ہے لیکن انھیں اپنے اعتبار سے استعمال کر کے نئی جہت عطا کی ہے۔ مثلاً مومن کو وہ اللہ کی برہان کہتے ہیں۔ لفظ مومن مذہبی اصطلاح ہے اور اللہ کی برہان بھی مذہبی اصطلاح ہے مگر اقبال نے اسے عصر حاضر کے تناظر میں نئی جہت عطا کی ہے۔ مذہبی اصطلاحات میں لا الہ الا اللہ، اشہد ان لا الہ الا اللہ، قُم باذن اللہ یا ذمّی[۱] وغیرہ اصطلاحات ہیں، جو بالکلیہ مذہبی ہیں۔ مگر ذمّی کو چھوڑ کر اقبال نے ہر اصطلاح کو اپنے انداز سے توسیع کر کے تعبیر پیش کر کے نیا رُخ عطا کیا ہے۔ یہاں اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بہت ساری اصطلاحات کا ماخذ قرآن حکیم ہے لیکن اسے ہم مذہبی اصطلاح نہیں کہہ سکتے مثلاً خودی، قلندر، عشق یہ وہ اصطلاحیں ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں اور یہ فارسی الفاظ ہیں لیکن معنوی اعتبار سے ان تمام اصطلاحات کا سرچشمہ مذہب ہے۔ گذشتہ صفحات میں ان کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی اصطلاحات سے صرف مذہب اسلام تو مراد نہیں ہو سکتا اور اقبال کے کلام میں گرونانک، گوتم بدھ، سوامی رام تیرتھ، شنکر اچاریہ وغیرہ ایک طرف

---

۱ ذمّی کا مال لشکر مسلم پہ ہے حرام   فتویٰ تمام شہر میں مشہور ہو گیا

بانگ درا ص ۲۱۷

ہیں تو دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ وغیرہ کا تذکرہ ہے لیکن جہاں تک ہندوستان سے وابستہ مذاہب کا تعلق ہے ان کی اصطلاحیں کلام اقبالؔ میں نہیں ہیں۔ صرف ان شخصیات کا تذکرہ ہے۔ ایک جگہ برہمن کا طلسم نظر آتا ہے لیکن یہ ترکیب ہے اصطلاح نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک دین موسوی میں عصا اور تجلّی، کلیمی شبانی وغیرہ کا ذکر ہے۔ ان ساری اصطلاحات کو انبیا کے کردار کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس مطالعے کے اختتام پر یہ عرض کرنا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے۔ وہ قرآن حکیم کے دائرے سے باہر نہیں ہو سکتا۔ نظریات و افکار کے تغیرات زندگی کو پیچیدہ بنا سکتے ہیں لیکن قرآن حکیم مستقل اور پائیدار ہے اور اسی لیے اس کے نظریات و افکار منہاج فکر کو سراج منیر سے روشن و تابندہ کرتے رہتے ہیں۔ ان میں کوئی تغیّر نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا ہے تو صرف اتنا کہ فکر پر چھایا ہوا اندھیرا دور ہوتا جاتا ہے اور اسی لیے اگر غور کیا جائے تو قرآن حکیم میں انسانوں کو راہِ نجات یا صراطِ مستقیم کی طرف متوجہ کر کے ہر شعبہ حیات کا اصول متعین کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ فنونِ لطیفہ بالخصوص شاعری کے بارے میں قرآن کا اصول بہت واضح ہے۔ (۱) شعراء ہر وادیٔ خیال میں چکّر لگاتے ہیں۔ (۲) ان میں قوّت عمل نہیں ہوتی لیکن صاحبانِ ایمان شعراء قابلِ قدر ہیں اس لیے کہ انھوں نے نیک کام کیا اور کثرت سے ذکر کیا۔[1] اس سے یہ نتائج مستنبط ہوتے ہیں کہ عمل کو خیال پر برتری حاصل ہے۔ چنانچہ اقبالؔ نے اس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے پورے کلام کو عمل کا نمونہ بنانے کی کوشش کی ہے اور وادیٔ خیال میں چکّر لگانے کی بجائے انھوں نے خود یہ کہا کہ ع

جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

نظر وادیٔ خیال کے لیے نہیں۔ وادیٔ حقیقت کے لیے ہونی چاہیئے۔ قرآن حکیم نے یہ ارشاد کیا کہ وہ شعراء ممدوح ہیں جو کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔ اُستاد محترم پروفیسر مجاور حسین رضوی صاحب نے مجھے اس طرف متوجہ کیا کہ ذکر کی کئی صورتیں ہیں۔ ذکر جب جلی

---

[1] سورہ شعراء۔ آیت ۲۲۴ تا ۲۲۷

ہو گا تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم اپنے کلام کی آرائش، زیبائش بلکہ وجود اور زندگی کے لیے اسے عروس ذکر سے آراستہ و ہمکنار کریں اور کلام میں ذکر کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ جا بجا قرآن، احادیث، بلند پایہ شخصیتیں کسی نہ کسی رُخ سے جلوہ گر ہوتی رہیں۔

اس لیے سب نقادوں نے اقبالؔ کو "شعرائے غاؤن" میں شمار نہیں کیا انھیں حکیم الاُمّت، ترجمان حقیقت کہا گیا اور اس کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کو وادیٔ تخیّل سے نکال کر زندگی کے حقائق پر نظر رکھتے ہوئے زجاج کو حریف سنگ بنا دیا۔

اقبالؔ نے کثرت سے ذکر کیا اتنا ذکر کیا کہ مجھ جیسا کمتر طالب علم، آیات، احادیث اور اصطلاحات کی تلاش میں زحمت کش صحرا نہ ہوا بلکہ محمل فکر میں ہر لمحہ لیلائے معنی سے ہمکلامی کا شرف ملتا رہا۔ اقبالؔ کے کلام کو اگر کوئی منزل اعجاز پر دیکھتا ہے تو اسے مبالغہ نہیں سمجھنا چاہیئے اس لیے کہ اس کا معتدبہ حصّہ اعجاز ابدی کا بخشا ہوا اعجاز ہے۔

اقبالؔ نے موضوعات کو بھی اہمیت دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ عالمی ادب میں ان چند شعراء میں سے ہیں جنھوں نے موضوعاتی شاعری کی ہے۔ موضوعات اور ان سے وابستہ تصوّرات "کُل" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس 'کُل' کی تعمیر میں مختلف جگہ سے چھوٹے چھوٹے نکتے تلاش کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اقبالؔ کے یہاں سب سے اہم موضوع خودی ہے۔ جس فلسفہ کی تعمیر میں انھوں نے بہت سی آیات کے تصوّرات سے استفادہ کیا ہے۔ اس لیے راقم الحروف نے ایک طرف تو ان انبیا کا تذکرہ کیا ہے جو اقبالؔ کے یہاں کہیں علامت ہیں اور کہیں ان کے معجزات یا واقعات سے ایک جدید آرکیٹائپ کی اقبالؔ نے تشکیل کی ہے۔ ان کی علامت شاہین، خودی کا تصوّر بھی اہم ہے۔ چنانچہ ان سب کا تذکرہ آیات کے ضمن میں آیا ہے۔ یہ مناسب معلوم ہوا کہ ان سب پر بہ حیثیت موضوع بھی تبصرہ کر دیا جائے۔

لا الٰہ الا اللہ

تمام آیات اپنی عظمت اور عزت و جلال کے ساتھ ستاروں کی طرح روشن ہیں مگر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اور لا الٰہ الا اللہ یہ دو آیتیں ہیں جو مہتاب و آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ رزم گاہِ حیات میں انسان کا سب سے بڑا اسلحہ بھی ہیں۔ فتح و کامرانی کی ضمانت بھی ہیں۔ اقبال نے لا الٰہ الا اللہ کے کبھی اس کے ایک جز کو استعمال کیا مثلاً ؎

زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ الا اللہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یا

مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ

اور کہیں اقبال نے پورا کلمہ لکھا ہے۔ بہرحال ان کی فکر کا محور و مرکز لا الٰہ الا اللہ ہے اور یہ انھیں کی فکر کا مرکز و محور نہیں ہے بلکہ حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم النبیین تک صرف لا الٰہ الا اللہ ہی حرف اوّل و آخر ہے اور سب اعتبارات اسی کی وجہ سے ہیں۔ چاہے اسے زماں کہہ دیجیے یا مکاں یا خیال یا وہم و گماں وغیرہ اسی لا الٰہ الا اللہ کا صحیح ادراک اگر ہوتا تو ابلیس اپنے گلے میں لعنت کا طوق نہ پہنتا اور فراق کی بجائے تقریب کی منزل پر فائز ہوتا۔ اس سے جب دریافت کیا گیا کہ انکار سجدہ کیوں ہے تو اس نے یہی کہا کہ میں لا الٰہ کی منزل میں ہوں الا اللہ نہیں سمجھ سکا۔ اس لیے کہ یہ کلمہ صرف نفی و انکار نہیں ہے بلکہ اثبات و اقرار ہے اور جب اثبات و اقرار کی منزل آتی ہے اور یقین پیدا ہو جاتا ہے تو پھر حکم نہ ماننے کا کیا سبب ہے۔

اسی لیے سرکار دو عالم صلعم نے ایک ہی کلمہ ارشاد فرمایا قولوا لا الٰہ الا اللہ اور اس ایک کلمہ میں دنیا کی ساری باتیں پوشیدہ تھیں۔ بڑے اختصار سے صرف چند گوشے پیش کئے جا رہے ہیں یہ وہ پہلو ہیں جن کا استنباط اقبال کی شاعری سے کیا جا سکتا ہے۔

لا اِلٰہ الاّ اللّٰہ

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الاّ اللّٰہ
خودی ہے تیغ، فشاں لا الٰہ الاّ اللّٰہ

یہ دَور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الاّ اللّٰہ

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لا الٰہ الاّ اللّٰہ

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں! لا الٰہ الاّ اللّٰہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں، نہ مکاں لا الٰہ الاّ اللّٰہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الاّ اللّٰہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الاّ اللّٰہ

جوہر میں ہو لا اِلٰہ تو کیا خوف — تعلیم ہو گو فرنگیانہ
ہے مرے سینۂ بے نور میں اب کیا باقی
لا الٰہ مردہ و افسردہ و بے ذوقِ نمود!

لا الٰہ الاّ اللّٰہ جہاں معبودانِ باطل کا افکار ہے وہاں اثبات باری تعالیٰ ہے اور جیسے ہی یہ کلمہ ادا کیا جاتا ہے ویسے ہی انسان کے "احساسِ نفس" اور "یقین ذات" کی منزل شروع ہو جاتی ہے وہ اپنی ذات کا بھی اثبات کرتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کا اعلان بھی کرتا ہے کہ اپنی ذات کا اثبات غرور و تکبّر نہیں بلکہ انسانی عبودیت کا اظہار ہے۔ یہی اظہار و اعلان نظریات کی بھی بُت شکنی کرتا ہے اس لیے کہ وہ سارے

نظریے جو اللہ کے قادرِ مطلق ہونے سے کسی طرف سے بھی متصادم ہوتے ہیں وہ سب باطل ہیں جس طرح حضرتِ ابراہیمؑ نے سارے بُت توڑ ڈالے تھے اور ایک بُت کو باقی رکھ کر اور پھر اس سے استدلال کرکے توحید کو ثابت کیا تھا ٹھیک اسی طرح لا الہ الا اللہ کا اعلان و اظہار بھی صنم کدۂ تصوّرات میں بُت شکنی کرتا ہے۔

لا الہ الا اللہ منزلِ تشکیک کو ختم کرکے منہاجِ یقین کو روشنی دلاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یقین کا سورج جیسے ہی طلوع ہوتا ہے وہیں وہم وگماں کا اندھیرا ختم ہو جاتا ہے۔

زماں و مکاں کے سارے تصوّرات جنھیں اوّلیت دی جاتی ہے وہ اس لیے محض باطل ہیں کہ بہر حال وہ اعتبارات ہیں ورنہ العصر، دہر کا تذکرہ قرآن حکیم میں ہے۔ ارشاد ہوا۔

کل من علیہا فان ونبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ تصوّر ہو یا حال یا مجاز، قیاس سب لا الہ الا اللہ کے تابع ہیں اقبالؔ نے کئی جگہ "لا الہ" کہا ہے[۱] کہیں اسے زرہ کہا ہے کہیں پناہ دینے والا وغیرہ اس سب کا مفہوم بھی یہی ہے کہ جہادِ زندگانی میں غازی بننے کے لیے یہی کلمہ کام آسکتا ہے اس کی تفصیل اور تشریح میں پورا ایک مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف عرض کرنا یہ ہے کہ اس کلمہ کا زبان سے ادا کرنا ایک عمل ہے اس پر ایقان علم ہے کہ علم و عمل کا یہ امتزاج زندگی کا سب سے بڑا سبق ہے اور اگر عمل، علم سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو وہ منافقت ہے اور اگر علم، عمل نہ پیش کر سکے تو وہ جہالت ہے اس لیے اقبالؔ نے جہاں بھی لا الہ کی ترکیب استعمال کی ہے اس سے مراد کلمہ طیبہ کا پورا مفہوم ہے۔

---

[۱] اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بعض صوفیا کی طرح سے اس کا ایک جز درست ہے کسی صوفی سے دریافت کیا گیا کہ پورا کلمہ کیوں نہیں پڑھتے تو انھوں نے کہا کہ میں ابھی منزلِ انکار میں ہوں لیکن اقبالؔ کے یہاں جو کلمہ آیا ہے انھوں نے ضرورتِ شعری کی بنا پر تخفیف روا رکھی ہے۔

اقبالؔ کا نظریۂ علم

ولقد ترکنا منھا آیۃً بینۃً لقومٍ یعقلون ۝ (سورہ عنکبوت آیت ۳۵)

"البتہ ہم نے اس بستی کو صریح عبرت کی نشانی بنا دیا ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں"۔ وتلک الامثال نضربھا للناسِ ما یعقلھا اِلّا العالِمون ۝ (سورہ عنکبوت آیت ۴۳)

"ہم ان مثالوں کو لوگوں کے لیے بیان فرما رہے ہیں انھیں صرف علم والے ہی جانتے ہیں"۔

یہ علم و حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

(لینن خدا کے حضور میں)

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لیے
لذّتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے[1]

وہ علم، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلّیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم!

(علم اور دین)[2]

---

[1] بالِ جبریل (غزلیات)

[2] ضربِ کلیم ص ۴۸۸

علم کی ایک تعریف تو یہ ہے کہ علم یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ یقین کا لازمہ عصمت ہے۔ عصمت، طہارت کو جنم دیتی ہے۔ طہارت معرفت ہے۔ معرفت اطاعت سکھاتی ہے اطاعت سے تقرب ملتا ہے اور یہی مومن کی معراج ہے۔ لیکن ایک علم وہ ہے جس کی بنیاد تخمین وظن پر ہے جو حجاب پیدا کرتا ہے جس کا منشاء مادّی لذّات ہے "حد" کا اشارہ علم کی کلّی حیثیت نہیں بلکہ تخفیفی حیثیت یعنی وہ علم جو اہلِ مغرب کی دین ہے۔ یہ علم مادّی تو ہے ہی اس کی بساط اور اس کا کمال برق و بخارات تک محدود ہے ــــ پروردگار عالم نے علم کی عظمت بیان کی ہے اور اہلِ علم کا تعارف جگہ جگہ کرایا ہے۔ "الرّاسِخون فی العلم" یا حضرت سلیمانؑ کے واقعے میں ارشاد ہے کہ وہ جس کے پاس کتاب کا تھوڑا سا علم تھا۔" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علم کی دو جہتیں ہیں۔

ایک علم محض جس کی اساس دلائل پر ہوگی اور جو اسباب وعلل کی اُفق سے آگے نہ دیکھ سکے گا۔ دوسرا وہ علم جس کی بنیاد راسخ ہوگی۔ جو قرآن کے ذریعے سے سکھایا جائے گا۔ یہ اتنا عظیم علم ہے کہ تخلیق انسان اس کے بعد کی منزل میں ہے۔ اقبالؔ نے جس علم کو ہدف بنایا ہے وہ علم محض ہے جو اپنا رشتہ عقل سے جوڑتا ہے۔

ہر شخص کی بات ضروری نہیں کہ سُنی جائے وہی بات سُنی جاتی ہے جو اس قابل ہے اور پھر ہر بات کرنے والے کا جواب نہیں دیا جاتا بلکہ کبھی کبھی تو "لن ترانی" کہہ کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔ لیکن پکارنے والا اگر اس منزل پر فائز ہے جو منزلِ تکمیل خودی کی ہے تو پھر اس کا جواب ملتا ہے چاہے یونسؑ شکم ماہی سے پکاریں۔ حضرت موسیٰؑ قبطی کے قتل کرنے کے بعد آواز دیں۔ وہ جواب دیتا ہے اور یہ جواب قولاً بھی ہے عملاً بھی ہے۔ اقبالؔ کے پاس ان آیات شریفہ کا اثر فلسفہ خودی میں تو ہے ہی "جواب شکوہ" میں بھی کہتے ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے — خاک سے اُٹھتی ہے گردوں پہ گذر رکھتی ہے

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مرا

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا　　اشک بے تاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا　　کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ ترا

شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

بندوں کو خدا سے ہم سخن کر دینا تکمیل خودی کی منزل ہے۔

اقبالؔ کے کلام میں انبیاءؑ کا ذکر

اقبالؔ مسلمان تھے اور اسلام میں انبیاء پر ایمان لانا جزو ایمان ہے لیکن اس کا ایک اور پہلو ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر نبی اپنے عہد میں اپنے دور کا رہنما رہا ہے اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اس نے قربانیاں پیش کی ہیں تکلیفیں اٹھائی ہیں، مصیبتیں جھیلی ہیں اور ہر لمحہ اور ہر منزل پر وہ پیکر اثبات و یقین رہا ہے اور اس نے اوہام و تشکیک کو دی۔ اقبالؔ اپنے فلسفیانہ افکار کی بنا پر اس ایک نکتہ سے باخبر اور آگاہ تھے کہ ارتقائے انسانی کے لیے یقین ناگزیر ہے اور جتنا یقین ضروری ہے اتنی ہی تشکیک کی شکست ضروری ہے۔ جناب آدمؑ سے لے کر تمام انبیاء کی حیات طیبہ میں یہ تصادم نظر آتا ہے اور اسی کے ساتھ معرکۂ خیر و شر بھی موجود ہے چنانچہ اقبالؔ نے جب یہ کہا ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

تو وہ اسی نکتے کی طرف متوجہ کر رہے تھے ان کے نظریے کی وضاحت ایک دوسرے شعر میں ہوتی ہے جب وہ یہ کہتے ہیں ؎

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰؐ عقل تمام بولہب

یعنی چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی کا ستیزہ کار رہنا شعری پیکر میں عشق و عقل یا یقین و گمان کی کشمکش کا دوسرا نام ہے اس لیے اقبالؔ کے یہاں صرف قصۂ آدمؑ کی رنگینی کا ذکر نہیں ہے بلکہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بھی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ بھی ہیں جو انبیاء کی سیرت مبارکہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

انبیاء کے تذکرے میں سب سے پہلا نام ظاہر ہے کہ جناب آدمؑ کا ہے۔ یہ بحث آگے کی گئی ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو نیابت الٰہی کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ آدمؑ کا پوری کائنات میں تصرف بھی عطیۂ الٰہی تھا۔ آدمؑ ہی نے آنے والے زمانے کے لیے بھی انسانی ارادے کا (چاہے وہ خطائے اجتہادی ہی کیوں نہ ہو) اعلان و اظہار کرکے کوشش پیہم کی جزا لینے کے لیے بخشے ہوئے فردوس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ آدمؑ وہ نقطۂ آغاز ہے جو مسجود ملائک ہے اور جسے بحر و بر کی سلطانی عطا کی گئی ہے۔ یہ شاہکار تمام مخلوق کے لیے ہیں۔

قرآن حکیم میں بکثرت آیتیں آدمی کی سعیٔ مشکور کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہ وہی آدمؑ ہیں جس کے لیے ارشاد ہے کہ "تم پکارو میں جواب دوں گا"[۱] اس طرح کی ساری آیتیں اور حضرت آدمؑ کا پورا تصور قرآن حکیم میں موجود ہے۔ اقبالؔ نے اس کی تعبیر اپنے انداز میں پیش کی ہے۔ آدمؑ کے بارے میں یہ سارے اشعار بالراست نہ سہی لیکن قرآن حکیم ہی سے مستعار ہیں۔

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدمؑ کو
(تصویر درد)

عروج آدمؑ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے
(بال جبریل)

لگی نہ مری طبیعت ریاضِ جنّت میں
پیا شعور کا جب جام آتشیں میں نے
(سرگذشت آدمؑ)

ان اشعار کے علاوہ فرشتے آدمؑ کو جنّت سے رخصت کرتے ہیں۔" رُوحِ ارضی آدمؑ کا استقبال کرتی ہے۔ سرگزشت آدمؑ وغیرہ کے عنوان سے اقبالؔ نے حضرت آدمؑ کے واقعات پر مفصّل روشنی ڈالی ہے۔

اقبالؔ کی خودی کا تصوّر اثبات و نفی، خیر و شر، یقین و گمان کی کشمکش میں اثبات خیر و یقین کی فتح کا نام ہے چنانچہ حضرت آدمؑ کے تذکرے میں اگر اثبات خودی کی منزل آدمؑ ہیں اور نفیٔ خودی کی منزل ابلیس میں تھی تو حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں بھی اقبالؔ کو یہی کشمکش نظر آئی اور ان کے یہاں ابراہیمؑ صرف قربانی پیش کرنے والے یا بُت شکن ہی نہیں ہیں بلکہ وہ جہاں بیں بھی ہیں اور انھیں بارگاہ کبریا سے خلیل کا تاج عطا ہوا ہے اس نے انھیں صاحبِ صدق بھی بنا دیا ہے اور ان کا پورا واقعہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ چنانچہ مندرجہ اشعار حضرت ابراہیمؑ کے واقعات سے اخذ کیے گئے ہیں۔

بُت شکن اُٹھ گئے باقی جو رہے بُت گر ہیں
تھا ابراہیمؑ پدر اور پسرِ آذر ہیں
(جواب شکوہ)

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرُود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے
(خضرِ راہ)

بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

دو مقامات تو ایسے ہیں جہاں اقبالؔ نے ابراہیمؑ کی بُت شکنی سے مثال دی ہے لیکن

خیمہ زن ہو وادیٔ سینا میں مانندِ کلیم
شعلۂ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ کر

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوق اِتنا
وہی "لن ترانی" سُنا چاہتا ہوں

لیکن جیسے جیسے اقبالؔ کا فلسفہ ایک جہت اختیار کرتا گیا انھوں نے موسیٰؑ کی حیات میں عصائے موسیٰ اور ضربِ کلیمؑ کو اپنے فلسفے سے بہت زیادہ ہم آہنگ پایا چنانچہ ۱۹۳۰ء کے بعد وہ اپنے ایک مجموعے کا نام ہی "ضربِ کلیم" رکھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیرِ مثالِ نسیم پیدا کر

ہزار چشمے ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اقبالؔ کے کلام کا محور و مرکز اسلامی معاشرہ ہے۔ اگر اسلامی معاشرہ کے جسم سے رُوحِ محمد نکال دی جائے تو معاشرہ مُردہ ہو جائے گا۔ اسی طرح دلوں میں اگر عشقِ محمد ہو تو دل مُردہ قرار پائے۔ آخرالزماں و خاتم النبی حضرت محمدؐ مصطفیٰ وہی اوّل وہی آخر۔ نبی کریمؐ کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب!
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب!

شوکت سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود !
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب !

شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ! میرا سجود بھی حجاب !

تیری نگاہ ناز سے دونوں مُراد پا گئے!
عقل، غیاب و جستجو! عشق حضور و اضطراب !

تیرہ و تار ہے جہاں گردش آفتاب سے
طبع زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب !

تازہ میرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بو لہب[1] !

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کُل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

---

[1] ذوق و شوق ۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ[1]!
اے رُوحِ محمدؐ
شیرازہ ہوا ملّت مرحوم کا ابتر!
اب تُو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

وہ لذّت آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے!

ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے!

اس راز کو اب فاش کر اے رُوحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے!

یہ بہت مختصر بیان ہے حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ کا پورا کلام اور اس کی اندرونی روح عشقِ محمدؐ ہے یا اس کی تاویل و تفسیر یا رُوحِ محمدؐ کا پرتو۔ لیکن جیسا کہ شروع میں ہی عرض کیا گیا اقبالؔ کے یہاں معرکۂ خیر و شر میں خیر کا نقطۂ تکمیل چراغِ مصطفےٰؐ ہے۔ وہ محمدؐ کی ذات میں انسانیت کے شرف کی تکمیل دیکھتے ہیں اور خلافت الٰہیہ کے منصب پر انھیں فائز پاتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ یہ کہتے ہیں ؎

سبق مِلا ہے یہ معراجِ مصطفےٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں!

---

[1] بالِ جبریل ص ۳۱۷۔

تو یہ صرف واقعہ معراج کی طرف اشارہ نہیں بلکہ انسانی عظمت کا ایسا اعلان ہے جس کا اگر کوئی نمونہ ہو سکتا ہے تو وہ ذات محمدؐ ہے۔ حضرت محمدؐ کے سلسلے کے تمام واقعات قرآن حکیم سے مستفاد ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی بیان کرنے کو جی چاہتا ہے کہ پروردگار عالم نے صرف چند انبیاء کو یہ شرف بخشا کہ ان کے نام سے کوئی سورہ موسوم کر دیا ان میں حضرت محمدؐ کا نام نامی بھی ہے۔ انبیاء کے نام کے سورے یہ ہیں۔ نوحؑ، ابراہیمؑ، مریم، محمدؐ، یوسف، یونس وغیرہ۔

خودی

خودی کا فلسفہ اقبالؔ کے کلام کا محور و مرکز ہے اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ لفظ خودی جن معنوں میں مستعمل تھا اقبالؔ نے پوری معنویت بدل دی۔ اسرار خودی کے دیباچے میں خودی کی یہ تعریف کی ہے۔ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات تمنیات مستیز ہوتے ہیں۔ ایک پراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بندی ہے۔ ایک جوہر جو اپنے عمل کی رُو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کا خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی۔[1]

"تشکیل جدید الٰہیات" میں اقبالؔ خودی کے متعلق قرآن کا سہارا لیتے ہوئے مندرجہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

"قرآن مجید کے نزدیک انسان کی انتہائی مسرت اور سعادت یہ نہیں کہ اپنی متناہیت سے محروم ہو جائے اس کے "اجر غیر ممنون" کا مطلب ہے اس کے ضبط نفس، اس کی یکتائی

---

[1] دیباچہ، اسرار خودی ص ۱۵

اور بحیثیت ایک خودی اس کی فعالیت کا زیادہ سے زیادہ شرف اختیار کرتے جانا، حتیٰ کہ عالمگیر تباہی کا وہ منظر بھی جس سے قیامت کی ابتدا ہو گی۔ اس قسم کی تربیت یافتہ خودی کے سکون و اطمینان پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو گا۔

ونفخ فی الصور فصعق من فی السموات ومن فی الارض الا من شاء اللہ (۳۹:۶۹)۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے استثنار کا اطلاق انہی شخصیتوں پر ہو سکتا ہے جن میں خودی کی شدت انتہا کو پہنچ گئی ہو[1]"

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ "قرآن پاک کی رو سے یہ عین ممکن ہے کہ ہم انسان کائنات کے مقصود و مدعا میں حصہ لیتے ہوئے غیر فانی ہو جائیں۔ ایحسب الانسان ان یترک سدی ٥ الم یک نطفۃ من منی یمنیٰ ٥ ثم کان علقۃ فخلق فسوی ٥ فجعل منہ الزوجین الذکر والانثیٰ ٥ الیس ذالک بقدرٍ علیٰ ان یحی یترا الموتیٰ ٥ (۷۵: ۴۰-۳۶)۔

یوں بھی جس ہستی کے ارتقار میں لاکھوں کروڑوں برس صرف ہوئے اس کے متعلق یہ کہنا کچھ غیر اغلب سا نظر آتا ہے کہ وہ ایک عبث اور لاحاصل سی شے کی طرح ضائع ہو جائے گی۔ لیکن وہ کائنات کے مقصود و مدعا میں شریک ہوں گی کہ ایک روز افزوں خودی کی حیثیت سے ونفس وما سوٰھا ٥ فالھمھا فجورھا وتقوٰھا ٥ قد افلح من زکٰھا ٥ وقد خاب من دسٰھا ٥ (۹۱: ۱۰-۷)

"مگر پھر روح میں افزونی پیدا ہو گی تو کس طرح اور یہ کیسے ہو گا کہ وہ فساد اور ہلاکت سے محفوظ رہے؟ اس کا جواب ہے عمل سے۔"

تبارک الذی بیدہ الملک وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر ٥ الذی خلق الموت والحیوٰۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا ٥ وھو العزیز الغفور ٥ (۶۷:۲)

گویا زندگی وہ فرصت ہے جس میں خودی کو عمل کے لاانتہا مواقع میسر آتے ہیں اور

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات۔ ص ۱۷۷

جس میں موت اس کا پہلا امتحان ہے تاکہ وہ دیکھ سکے اسے اپنے اعمال و افعال کی شیرازہ بندی میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔ اعمال کا نتیجہ نہ لطف ہے نہ درد۔ اعمال یا تو خودی کا سہارا دیتے یا اس کی ہلاکت اور تباہی کا سامان پیدا کرتے ہیں لہذا یہ امر کہ خودی فنا ہو جائے گی یا اس کا کوئی مستقبل ہے عمل پر موقوف ہے اور اس لیے خودی کو برقرار رکھیں گے۔ تو وہی اعمال جن کی بنا اس اصول پر ہے کہ ہم بلا امتیاز من و تو خودی کا احترام کریں۔"[1]

اقبال نے خودی کے سلسلے میں یہ تصور پیش کیا ہے۔ اس کے شارحین یہ تصور پیش کرتے ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم فرماتے ہیں۔

"اقبال کے معاصرین میں خودی کے فلسفہ کو پیش کرنے والے اور بھی اکابر مفکرین ہیں جن کے افکار سے اقبال پوری طرح آشنا تھے۔ ان میں سے بعض کے مداح اور بعض سے کم و بیش متاثر بھی تھے۔ نطشے، فشٹے، برگساں اور ولیم جیمز کے نظریات ماہیت وجود پر بہت کچھ وہی ہیں جو اقبال کی تعلیم میں بھی ملتے ہیں اس سے بعض نقادوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اقبال ان کے مقلد تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال نے ان مفکرین سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن یہ اقبال کے کمال پر کوئی دھبہ نہیں آتا۔ اقبال ان سب سے کسی ایک پہلو میں متفق ہے اور کسی دوسرے اساسی پہلو میں شدید اختلاف رائے بھی رکھتا ہے جہاں تک نطشے کا تعلق ہے میں اس کے متعلق اپنے مقالہ "نطشے رومی اور اقبال" (مطبوعہ انجمن ترقی اردو) میں مبسوط بحث کر چکا ہوں جسے یہاں دہرانا نہیں چاہتا۔ اقبال کا ایک مخصوص انداز فکر اور نظریۂ حیات تھا اس نخل کی پرورش اس نے مختلف عناصر سے کی۔ ان میں سے کچھ عناصر خاص قرآنی تعلیم کے ہیں۔ کچھ رومی کے صوفیانہ تاویل اور روحانی تجربے کے۔ کچھ مغرب کے ان مفکروں کے افکار کے جن کا اقبال ہم نوا ہے یا جو اقبال کے ہم صفیر ہیں۔"[2]

نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں :-

"خودی کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے لیے قرآن حکیم کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جو آخری کتاب الٰہی ہونے کی وجہ سے اس مسئلے میں بالخصوص قول فصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم نے روح یا خودی کی حقیقت اپنے مخصوص الہامی انداز میں صرف تین الفاظ میں

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات ص ۸۰، ۱۷۹ ۔ [2] فکر اقبال ص ۸۷، ۲۸۶

بیان کردی ہے جسے دیکھ کر انسان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس نے فی الواقعہ کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔ بہر کیف وہ کہتا ہے۔

ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی (۱۷ : ۸۵)۔

"اے پیغمبر آپ سے روح کے متعلق استفسار کرتے ہیں ان سے کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے "امر" میں سے ہے اس آیت میں روح کو "من امر ربی" کہا گیا ہے[1]"۔ آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "قرآن مجید میں بھی خودی کے اس رہنما وظیفے کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے"۔ اور مندرجہ بالا آیت کا حوالہ دیتے ہیں۔

آگے لکھتے ہیں :-

"خودی قوت ازل کے بحرِ بے کراں کا ایک قطرہ ہے جو اپنی محدودیت میں بھی لامحدودیت کے امکانات رکھتا ہے۔ خودی متعین تو ہے مگر نفسیات کے ماوراء چلے جانے کی بھی قوت رکھتی ہے ... لا تنفذون الا بسلطان (۵۵ : ۳۳)۔ وہ چوں کہ رب حکیم و بصیر کا انفاخ روح ہے اس لیے خودی دانش و شعور بھی رکھتی ہے[2]"۔

"قرآن حکیم کے نزدیک اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اور اس نے اپنی نورانی روح سے وجود انسانی میں پھونکا تو اس کے اعجاز سے انسان میں شعور و آگہی پیدا ہو گئی علامہ اقبال نے اس تصور قرآنی سے یہ استنباط کیا ہے کہ خودی نقطۂ نور ہے نیز وہی سرچشمۂ حیات بھی ہے[3]۔"

یہ سارے اقتباسات یعنی خود اقبال کے تصورات، اجمال کی تفصیلات اور اقبال کے شارحین کی تصریحات اور قرآن حکیم کا اپنے کرم کی طرف تصور خود پر محیط ہونا ـــــ ان سب کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب یہ چند اشعار پڑھ لیجئے۔

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا[4]

---

[1] اقبال و جمالیات ص ۲۲ [2] ص ۲۴ ایضاً [3] ص ۴۰ [4] بانگ درا ص ۲۷۳

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آ بجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں !

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر اُبھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مرد ہیچ کارہ نہیں[1]

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی!

تیری زندگی اسی سے، تیری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی !

کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللّٰہ
خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صُورِ اسرافیل !

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے !
خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے !

---

[1] بالِ جبریل ص ۳۳۶

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات!
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات!

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند!
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند!

اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک!
من و تو میں پیدا، من و تو سے پاک!

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے!
نہ حد، اس کے پیچھے نہ حد سامنے!

زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسّس کی راہیں بدلتی ہوئے
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئے

سُبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں!
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں!

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے![1]

---

[1] (ساقی نامہ) بالِ جبریل صفحہ ۱۹۰

خودی کا نشیمن تیرے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھوں کے تِل میں ہے

خودی کا نگہباں کو ہے زہر ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دُنیا میں گردن بلند

فروغالِ محمود سے در گذر
خودی کو نگہہ رکھ، ایازی نہ کر

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

یہ عالم، یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت

یہ عالم، یہ بُت خانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں
مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں

تیری آگ اس خاک داں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں

خودی شیر مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید

یہ ہے مقصد گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار![1]

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے، تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ[2]

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر!

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر!

نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر![3]

۱؎ ساقی نامہ ص ۲۱، ۲۰۴   ۲؎ ضرب کلیم ص ۴۴   ۳؎ ضرب کلیم ص ۵۳۸ (خودی کی زندگی)

شاہین کا تصوّر

وَاذ قالَ ابراهيمَ ربِ ارنی کیف تحی الموتیٰ ط قالَ اولَمْ تؤمِن ط قالَ بلیٰ ولکن لیطمئنَ قلبی ط قالَ فخذ اربعتہً من الطیر فصرھنَّ الیک ثُمَّ اجعَل علیٰ کل جبلٍ منھنَ جزءً ثمَّ ادعھُنَّ یاتینک سعیاً ط وا علم ان اللہ عزیزٌ حکیم ہ (آیت ۲۶۰ سورہ بقرہ)۔

"اور جب ابراہیمؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھے دکھا کہ تو مُردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے؟ جناب باری تعالیٰ نے فرمایا کیا تمھیں ایمان نہیں؟ جواب دیا۔ ایمان تو ہے لیکن میرے دل کو تسکین ہو جائے گی۔ فرمایا" چار پرندے کو ان کے ٹکڑے کر ڈالو پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو۔ پھر انھیں پکارو تمھارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے۔ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمتوں والا ہے[۱]۔"

اس آیت شریفہ کی تفسیر میں یہ بتایا گیا ہے کہ چار پرندے مور، مرغ، کبوتر اور کوّا جذبۂ نمائش، جنس، لہو و لعب اور آرزو کے بہترین مرقعے ہیں۔ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہی انسانیت کا کمال ہے۔

بظاہر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت شریفہ سے اقبالؔ مستفاد نہیں ہوئے لیکن راقم الحروف کے چند معروضات ہیں۔

۱۔ پرندے انسانی خواص کی علامت بن سکتے ہیں جیسے مور نمائش، مرغ شہوت، کبوتر لہو و لعب وغیرہ کے لیے۔

۲۔ اقبالؔ نے اس پہلو کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پرندوں سے علامت کا تصوّر

۱ے ترجمہ تفسیر ابن کثیر۔ جلد اوّل صہ ۱۴ پ ۳

لیا ہے۔

۳۔ فارسی شاعری کے اثر سے اُردو میں بُلبل، قمری کی علامتیں موجود تھیں خصوصاً بُلبل، کبوتر بھی علامت کے طور پر ضرور آیا مگر کسی جذبے کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ قاصد اور پیغامبر بنتے ہیں۔

۴۔ اس پس منظر کو سامنے رکھا جائے تو اقبال کے یہاں شاہین، کبوتر اور عقاب علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور اُردو فارسی کی روایتی شاعری میں بُلبل کے زیر اثر اقبال کی علامتیں نہیں ہیں بلکہ قرآن سے مستفاد ہوتے ہوئے اقبال نے جن انسانی خواص کو ان پرندوں میں دیکھا اس کی بنیاد پر انھیں علامت بنایا۔ موضوع اقبال کی علامت نگاری نہیں۔ لیکن اقبال کا شاہین صرف پرندوں کی دنیا کا درویش نہیں معلوم ہوتا بلکہ فقر کا وہ پیکر ہے جس کی انسانی شکل قرون اولیٰ کے مجاہدین تھے۔

کتابیات

۱۔ قرآن مجید — مترجم — مولانا اشرف علی تھانوی۔

۲۔ قرآن مجید — ترجمہ — شیخ الہند مولانا محمود الحسن

۳۔ قرآن مجید — 〃 (مقبول ترجمہ) — حکیم سید مقبول احمد صاحب دہلوی

۴۔ قرآن مجید — تفسیر — علامہ جوادی تنظیم ۱۹۹۰ء جگت نرائن روڈ لکھنؤ

۵۔ تفسیر ابن کثیر — علامہ ابن کثیر مترجم، مولانا عبدالرشید نعمانی ۱۹۸۶ء اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان دہلی

۶۔ معارف القرآن — حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مرحوم ربانی بکڈپو

۷۔ قرآن مجید — مترجم عکسی — محمد احمد رضا خاں صاحب، بریلوی، موسوم بہ کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن مع تفسیر سید محمد نعیم الدین۔

۸۔ تفہیم القرآن — مولینا ابوالاعلیٰ مودودی

۹۔ ترجمان القرآن — مولانا ابوالکلام آزاد

۱۰۔ صحیح بخاری شریف کامل اردو سلسلہ صحاح ستہ تجرید مرتبہ امام المحدثین حجۃ الاسلام حضرت علامہ شیخ محمد بن اسمٰعیل بخاری۔ مترجم مولوی عبدالدائم صاحب جلالی

۱۱۔ صحیح بخاری شریف، مترجم مولانا عبدالحکیم خاں اختر۔

۱۲۔ کلیات اقبال اُردو — اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، سوئی والان دہلی (بار اول ۱۹۸۱ء)

۱۳۔ کلیات اقبال — کمرشیل بک ڈپو، چار مینار

۱۴۔ اسرار خودی — محمد اقبال

۱۵۔ تشکیل جذبہ الٰہیات — اقبال — مترجم سید نذیر نیازی اسلامک بک سنٹر، کلاں محل نئی دہلی

۱۶۔ اقبال اور قرآن — ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں اقبال اکیڈیمی طبع دوم ۱۹۸۸ء پاکستان

۱۷۔ متاعِ اقبال — فضل الٰہی عارف — شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، اشاعت اوّل ۱۹۷۷ء حیدر آباد، کراچی

۱۸۔ اقبال اور جمالیات — نصیر احمد ناصر — اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئی والان دہلی بار اوّل

۱۹۔ ادب میں جمالیاتی اقدار — ایک مطالعہ — از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی۔ اشاعت اوّل ۱۹۷۹ء مکتبہ الفاظ علی گڑھ

۲۰۔ فلسفۂ جمال — از ریاض الحسن

۲۱۔ سیرت اقبال — از پروفیسر محمد طاہر فاروقی لاہور ۱۹۶۶ء

۲۲۔ فکر اقبال — خلیفہ عبدالحکیم ایجوکیشنل بک ہاؤس ایڈیشن ۱۹۷۷ء

۲۳۔ تشبیہات اقبال — پروفیسر نذیر احمد اقبال اکیڈیمی پاکستان، طبع اوّل ۱۹۷۷ء

۲۴۔ A history of Philosophy By Ander Wedberg

۲۵۔ Introductory reading in Philosophy

By Aurom Stroll Richard H. Popkin

۲۶۔ اُردو ادب میں فلسفیانہ افکار — غیر مطبوعہ — پروفیسر سید مجاور حسین رضوی

۲۷۔ اقبال پر پندرہ مقالات، ترتیب احسان الٰہی سالک۔ ایس۔ اے بخاری عزیز پبلشرز چوک اردو بازار لاہور ایڈیشن اوّل ۱۹۷۷ء۔

۲۸۔ اقبال کی شاعری میں عورت کا مقام مقالہ برائے ایم۔ فل، مقالہ نگار سیدہ رضیہ
شعبہ اردو یونی ورسٹی آف حیدر آباد

۲۹۔ نوائے مشرق (علامہ اقبال اور مولانا مودودی کا تقابلی مطالعہ) از سعید احمد،
تاج کمپنی دہلی ۱۹۸۳ء

۳۰۔ رسائل و مسائل از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

۳۱۔ اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر۔ پروفیسر سید مجاور حسین رضوی،
اتر پردیش اُردو اکاڈمی

۳۲۔ منازل فی العرفان فی علوم القرآن (حضرت مولانا الحاج محمد سالک کاندھلوی)
شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

۳۳۔ باغ و بہار میر امن دہلوی رشید حسن خاں، انجمن ترقی اُردو ہند،
سن اشاعت ۱۹۹۲ء

ISBN-81-7160-065-4